نگار

قیمت { فی پرچہ ۵۰ نئے پیسے
سالانہ دس روپے

نگار
ڈاکٹر ذاکر حسین نمبر

ذاکر صاحب ہمارے تعلیمی رہنماؤں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں انھوں نے نظام تعلیم کو ہندوستانی مزاج دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے جس کی ایک جیتی جاگتی مثال جامعہ ملیہ ہے۔ علی گڑھ کو بھی ایک دور ابتلا میں جو ہمت ملی وہ انھیں کی ذات کا پرتو ہے اور اس کے مزاج میں نرمی و گرمی کی جو مخصوص صفت پیدا ہوئی وہ بھی ذاکر صاحب کے طفیل ہے۔ لیکن اس سب سے الگ ہو کر ان کی ایک ادبی حیثیت بھی ہے۔ اگرچہ کتابی شکل میں ذاکر صاحب کی چند ہی تحریریں آئی ہیں اور ان میں سے بھی کئی تراجم ہیں اس کے علاوہ ایک بیش بہا ذخیرہ تقاریر خطبات پیغامات اور خطوط کی شکل میں بکھرا ہوا ہے۔ ادارۂ نگار یہی کوشش کریگا کہ اس میں ذاکر صاحب کی ساری تحریروں کو جمع کر دیا جائے تاکہ ایک صاحب طرز ادیب کی نگارشات دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جائیں اور ادب و انشا کے بیش بہا ذخیرے کی شیرازہ بندی ہو سکے۔

آپ کے پاس ذاکر صاحب کے

• پیغامات • خطوط • تقاریر اور • خطبات میں سے

جو کچھ بھی ہو وہ ہمیں مرحمت فرمائیے تاکہ یہ نمبر زیادہ سے زیادہ جامع ہو سکے۔

ضروری اعلان: پاکستانی خریدار نگار کا سالانہ چندہ اس پتہ پر بھیجدیں رسالہ جاری کر دیا جائے گا نمائندہ نگار این ۶۱۷ سمن آباد لاہور

نگار

ایڈیٹر: اکبر علیخاں

جلد ۴۲ | فہرست مضامین اپریل ۱۹۶۳ء | شمارہ ۴

ملاحظات		۲	اقبال بحیثیت استاد	میاں عطاء الرحمٰن مرحوم	۳۱
خطبۂ صدارت یوم اقبال	رشید احمد صدیقی	۵	اکبر اور اقبال	نور محمد ایم اے	۳۸
اقبال کا فکری ارتقاء	محمد عبدالسلام خاں	۱۲	شاعر مشرق	سعادت نظیر	۴۷
اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط	ڈاکٹر محمود الٰہی	۲۹			

ملاحظات

اقبال اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جس کی شاعری کا شمار مقصدی شاعری میں ہوتا ہے اور جس کے پاس کہنے کے لیے وہ تھا جو اس کے علاوہ اگر کسی شاعر کے پاس ہوتا بھی تو اتنا جاندار کشش اور تاثیر سے بھرا پرا نہ ہوتا جتنا اقبال نے اسے بنا دیا۔

شاعری اور مقصد قریب کی چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا ملاپ بہت دور کی بات ہے اتنی دور کی بات کہ اردو شاعری کی تاریخ میں صرف تین مثالیں ملتی ہیں۔ حالی، اکبر اور اقبال، عجیب اتفاق ہے کہ اقبال کے فکر و فن کا ذکر آتے ہی حالی اور اکبر بھی معرض بحث میں آجاتے ہیں۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ حالی اور اکبر کا رول ایک محدود عرصہ روزگار کے لیے تھا اور اب ہم قصہ ماضی کی طرح ان سے کبھی لطف لیتے ہیں اور کبھی عبرت حاصل کرتے ہیں۔ یہ دونوں اپنی ملت کے مرثیہ خواں بن کر رہ گئے ایک غم و اندوہ سے رو پڑا اور دوسرے نے دکھ اور درد کی نشتریت سے طنز و مزاح کو تیز کیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا حالی اور اکبر کا ذکر اقبال کے ساتھ لازماً آتا ہے اس لیے کہ اقبال اپنے ابتدائی دورِ شاعری میں ان دونوں سے متاثر ہوئے ہیں شکوہ و جواب شکوہ اقبال کے ذہن پر حالی کی گرفت اور بانگ درا کا ظریفانہ کلام اکبر کی گرفت کے واضح نشانات ہیں جن کے بعد شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

حالی اور اکبر سے اقبال کی اثر پذیری کی وجہ وقت کا مطالبہ کہی جا سکتی ہے یا ان کا دل و دماغ اس سے زیادہ کا ثبوت نہیں ملتا۔ اقبال کا ذہن جو مطالبات کیے تا ہے اس کو مطمئن کرنے کے لیے آپ ہی سوچیے ان دونوں کے پاس کیا ہے۔ ان کے خلوص کے تو وہ ہمیشہ قایل رہے ہیں لیکن ان کا تاثر زیادہ دن قائم نہیں رہا اور وہ ان کی تقلید سے بہت جلد آزاد ہو گئے۔

وہ زبان و بیان میں غالب اور داغ سے بھی متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ اقبال کی بالکل ابتدائی غزلوں پر داغ کی زبان کا ٹھپہ لگا ہوا ہے۔ لیکن جیسے جیسے ان کا ذہن بالغ تر ہوتا جاتا ہے غالب کی "بیدلیت" کا جادو چڑھتا نظر آتا ہے۔ اردو کے کلاسیکی شاعروں میں وہ غالب کے علاوہ کسی اور کا ساتھ دے بھی نہیں سکتے۔ یا پھر

کسی قدر عرفی و نظیری کی بلند خیالی کا حسن انھیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کیوں کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو ثریا کی سنہری بوتل"۔

اقبال کا کلام اپنے مواد، وزن و وقار اور قدرت زبان و بیان کے لحاظ سے اردو شاعری کا نمایاں ترین کارنامہ ہے۔ مواد کے معاملے میں اقبال کہہ سکتے ہیں کہ "متمتع زہر گوشہ یافتم اگر جہان کی آخری پناہ گاہ اسلام ہے۔ ان کی رائے میں توازن یا کسی خیال پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کے یہاں خیالات کوئی وقتی رد نہیں تھے بلکہ اقبال کا ذہن ہزار بار غور و فکر کی کسوٹی پر کس کر ان خیالوں کو رد و قدح کی منزل سے گزارتا تھا ان کے موضوعات زندگی کے جن سنجیدہ مسائل سے علاقہ رکھتے تھے ان کا لازمی نتیجہ کلام میں وزن و وقار کی صورت میں جلوہ گر ہونا چاہیے تھا۔ زبان و بیان پر وہ خود اثر انداز ہوتے تھے اور اس معاملے میں وہ پھر منفرد ہیں۔ کتنے ہی الفاظ ایسے ہیں جن کے معانی اقبال کی زبان میں کچھ اور ہیں۔ قلندر۔ فقیر۔ مومن۔ خودی جیسے الفاظ کے مفاہیم کو جو وسعت اقبال نے دی اُس کا ہلکا سا بھی تصور کسی دوسرے کے یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ اقبال کا فقیر اور قلندر اخلاق علم اور عمل کے لحاظ سے جس بلندی پر فائز ہے وہ ہمارے عام عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ ایک معمولی کرشمہ ہی اقبال کی زبان کا۔

یہ درست ہے کہ اقبال کے کلام میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد ایسا ہے جسے تاریخی نقشے کے طور پر تو ہم آپ استعمال کر سکتے ہیں لیکن اقبال کے خلاف کوئی فرد جرم مرتب نہیں کر سکتے۔ وہ کون شخص ہے جس کے یہاں فکری ارتقا نہیں ہوتا حق کی تلاش و جستجو میں سالک کو مختلف منازل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس سفر کا کوئی اثر اس پر مرتب نہ ہو۔ یہ سب تو راستے کی باتیں ہیں منزل پر پہنچ کر اس نے کیا کہا اصل بات تو یہ ہے۔

اقبال کو زبان و مکان کی قیود میں رکھ کر نہ ہم اس کے ساتھ بھلا سلوک کرتے ہیں اور نہ اپنے ساتھ۔ اس کی آفاقیت کے اپنے تقاضے ہیں۔ حق کو کسی سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، حق سب کا ہے اور سب کے لیے ہے اُسے جغرافیائی حد بندیوں میں بھی نہیں جکڑا جا سکتا۔ اور نگ و نسل سے بننے والی دیواریں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اقبال کا کلام بھی فریاد ی ہے کہ اسے کسی مصنوعی قید و بند میں نہ رکھا جائے۔ اس کا خطاب اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر قدغن نہ کی جائے یہ مطالبہ ہمیشہ حق کا مطالبہ رہا ہے۔ اگر کبھی حق پر ان حد بندیوں کو جائز کیا گیا تو وہ خود ان بندشوں کے خالقوں کے لیے بھی سود مند نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ حق کو اپنانے کے لیے جس وسعت قلب و نگاہ کی ضرورت ہے اگر حق کی ملکیت کے دعوے دار کے پاس ہوتی تو اس تفریق کا امکان ہی کہاں تھا۔

آپ ہی بتائیے کہ اقبال کے مندرجہ ذیل چند اشعار میں وہ کونسی بات ہے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ اس کا خطاب ہندوستان کے تمام شہریوں سے نہیں کسی مخصوص فرقے سے ہے۔ یا اس کا مطالعہ صرف ایک فرقے کی قوت فکر و عمل میں بیداری اور جوش و خروش کا باعث ہو سکتا ہے باقی میں نہیں

غیرت ہے بڑی چیز جہاں تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت آدم کی قبا چاک

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں! نشہ قوت ہے خطرناک

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

آ تجھکو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ہے
دلیلِ کم نظری قصۂ قدیم و جدید

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

وہ علم نہیں زہر ہے احرار کے حق میں
جس علم کا حاصل ہے جہاں میں دو کفِ جَو

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

وہ فریبِ خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

بچھائی ہے جو کہیں عشق نے بساط اپنی
کیا ہے اس نے فقیروں کو وارثِ پرویز

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہگزر کو کیا خبر ہے

اقبال کی فکر نے جو چراغ روشن کیا ہے اس کو تہ داماں رکھنے سے کسی کو راستہ نہ ملے گا۔ برصغیر ہند اپنے اس عظیم فرزند سے اگر اس دور میں بھی کچھ نہ لے سکا جب کہ یہ دور تعمیر و ترقی کے امکانات کا جائزہ لے رہا ہے تو کب لے گا، جب آنے والا مورخ ہماری کوتاہیاں گناتے وقت بتائے گا کہ ہمیں اپنے اچھوں کو پہچاننا نہیں آیا۔ آئندہ نسلیں شرم سے گردن جھکا لیں ان نسلوں کی سرخروئی کا سامان ہم آج بھی کر سکتے ہیں جس میں خود ہماری بھی سرخروئی ہے۔

نگار کا زیرِ نظر شمارہ ہندوستان کے اس قابلِ فخر فرزند کی یاد کے لیے شایع کیا جا رہا ہے۔ اس میں جو تحریریں شامل ہیں ان میں سے آج سے ۱۸ سال پہلے رامپور رضا انٹر کالج کے یوم اقبال میں پڑھی گئی تھیں یعنی "خطبۂ صدارت" اور "اکبر و اقبال" یہ تحریریں ایک خاص حلقے سے آگے نہ پڑھ سکیں اس لیے ان کو اس نمبر میں شریک کر لیا گیا ہے۔ ان کو پڑھتے وقت لازماً ۱۹۴۵ء کو سامنے رکھنا چاہیے۔

مولانا عبدالسلام خاں صاحب کا مضمون خصوصیت سے اسی شمارے کے لیے لکھا گیا ہے۔ یہ مضمون اپنی موجودہ شکل میں نامکمل ہے لیکن اس میں اقبال کے فکری رجحانات کی نشاندہی صرف ۱۹۰۸ء تک کی گئی ہے۔ آئندہ قسطوں میں اس سلسلے کی مزید کڑیاں سامنے آئیں گی۔ صاحب مقالہ اقبال پر اپنے کئی وقیع مضامین کی وجہ سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ نگار کے اس جدید دور میں موصوف سے دستگیری و تعاون کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

خطبۂ صدارت یوم اقبال

جو گورنمنٹ رضا انٹرمیڈیٹ کالج رامپور میں ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو پڑھا گیا

رشید احمد صدیقی

بزرگان رامپور، دوستو اور عزیزو، آپ نے مجھے یاد فرما کر میری توقیر بڑھائی اسے میں ذاتی منزلت کے ساتھ شعبۂ اردو کی بھی منزلت سمجھتا ہوں جس کے متعدد ارکان اس وقت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ سرور صاحب آپ میں ممکن ہے پرانے ہو چلے ہوں لیکن ان کی یاد ہمارے یہاں تازہ ہے اور مدتوں تازہ رہے گی۔ دوسرے مسٹر مسعود حسین خاں ایم، اے ہیں جن کا مقالہ آپ سہ پہر میں سنیں گے، یہ ہمارے ہاں پی، ایچ، ڈی کے طالب علم اور شعبہ میں معلم بھی ہیں تیسرے مسٹر نور محمد ہیں جنھوں نے اردو میں ایم، اے فائنل کا امتحان دیا ہے۔ ان کا مقالہ بھی آپ کے سامنے آئے گا۔

صاحبو! مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال مرحوم کا کلام کبھی ڈیفنس آف انڈیا کی زد میں آیا تو آپ کے آل احمد سرور صاحب سب سے پہلے گرفتار کر لیے جائیں گے باوجود اس کے کہ انھوں نے ریاست میں پناہ لی ہے۔ سرور صاحب نے اقبال کے کلام کا مطالعہ جس الفت و قابلیت سے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں قابل رشک نہیں رہا ہے۔ اقوال سے گزر کر کہیں انھوں نے اپنے اعمال میں بھی اقبال کو دخل دینا شروع کیا تو میں سمجھتا ہوں ریاست رام پور اور مسلم یونیورسٹی کے درمیان کہیں معلق نظر آئیں گے۔ گو مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ اس حال میں بھی یوم اقبال منانے سے باز نہ آئیں گے۔

صاحبو! اردو تاریخ کا یہ پہلو آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا کہ اردو شاعری ہمارے گفتنی و ناگفتنی حالات کی جس حد تک ترجمان رہی اس حد تک ان حالات کو بہتر و برتر بنانے میں معین نہ ہوئی۔ ہمارے شعر و ادب میں علیگڑھ تحریک یا حالی کے عہد سے پہلے ذہنی تجربوں یا تہلکوں کے نشان نہ ملنے کے برابر ملتے ہیں۔ ہمارے شعرا شاعری میں عبادت تو خوب خوب کرتے تھے، حسن عمل سے کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ وہ مشکل سے مشکل بحر قافیہ اور ردیف میں جلد سے جلد سہ غزلہ چہار غزلہ تیار کر لیتے تھے لیکن زندگی اور زمانے کے مطالبے کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے۔ ان کے ہاں "شکست کی آواز" ملتی ہے دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان نہیں ملتا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمارے ان شعرا پر زندگی و زمانہ کی چوٹوں کا اثر نہ ہونا تھا۔ البتہ وہ ان چوٹوں کو ابنائے جنس کی چوٹ سمجھنے سے قاصر تھے۔ بعض دوستوں نے ان کی متفرق نظموں یا غزلوں میں زندگی اور زمانہ کا کرب یا دھڑکن دریافت کی ہے لیکن میں اس نظریہ کا کچھ زیادہ قائل نہیں ہوں جس طمطراق سے ہم نے جہاں اور بہت سے معرکے سر کیے ہیں یہ ایک سہی! اردو شاعری میں ہمارے بیشتر شعرا نے تفریح یا تفرع سے اور کام لیا ہے۔ شاید ہی کسی اور ملک یا ادب میں شاعری کی یہ گت بنی ہو۔ محض چند ایک سے قطع نظر بقیہ نے زندگی کا غم غلط کرنے کی خاطر شاعری کی پناہ پکڑی زندگی سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعری نہیں کی۔

صاحبو! میں اتنا ماننے کے لیے تیار ہوں کہ ہمارے ہاں کچھ شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنی رجحانات کو بعض مواقع پر اچھے راستے پر لگایا ہے اس کی پہلی مثال انیس کے ملتی ہے۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا جو رنگ و آہنگ تھا اس کو منقلب کر دینے کا سہرا انیس اور انیس کے

کے خاندان کے سر ہے۔ انھوں نے قوم کے مزاج کو پہچان کے شاعری کا رخ بدلا لیکن اپنے زمانے کے ڈھنگ کو نہ بدل سکے شعر و ادب کو گرانمایہ کیا۔ مذہبی شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ محسن کے اس کمال کا اعتراف کم لوگوں نے کیا ہے کہ وہ لکھنؤ کے تنہا شاعر ہیں جنھوں نے لکھنوی شاعری کے کمزور پہلو کو اپنے نعتیہ کلام سے دل کش بنا دیا، دیا شنکر نسیم ان سے پہلے گزرے ہیں جن کی گلزار نسیم کی بے ساختہ صناعی کی نظیر ہماری شاعری میں نہیں ملتی۔ لیکن جس پل صراط پر محسن کو چلنا پڑا نسیم اس سے بالکل محفوظ رہے۔ انیس اور انیس کے کلام نے ہمارے ادبی مزاج کو سدھارا اور سنوارا۔ بالخصوص اس وقت جب ہمارے ہاں سوز مزاج کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

انیس کے بعد حالی نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو موڑا اور اس کو ایسی وادیوں سے گزرنے کا موقع دیا جہاں نہ صرف اس دھارے کی حیات بخشی میں اضافہ ہوا بلکہ اس کی روانی میں زور آیا۔ حالی سے پہلے شعرا تلخیٔ کام و دہن کی آزمائش میں بطور کار خیر شریک ہو جایا کرتے تھے۔ حالی زہر غم قلب و جگر میں اتار چکے تھے۔ ان کا رنج والم شخصی یا رسمی نہ تھا۔ ان کے ماتم سے انسانیت ماتم گسار نظر آنے لگتی تھی۔ حالی کے ماتم میں حرکی و تخلیقی استعداد پائی جاتی ہے۔ حالی نے غالباً سب سے پہلے اس حقیقت کو منکشف کیا کہ خلوص دردمندی، علم آرٹ اور انسان سب کی معراج ہے شاعری میں حالی نے سچائی کو آزمائش و زیبائش پر ترجیح دی۔ حالی کا لہجہ دھیما ہے لیکن اس میں یہ قابلیت ہے کہ وہ شور و سکوت دونوں میں یکساں سنائی دیتا ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ حالی کی شاعری نے مسلمانوں میں اضمحلال اور افسردگی پیدا کر دی۔ یہ بات درست نہیں ہے حالی کی مثال اس شخص کی ہے جو سردار کی بے گور و کفن نعش پر مجہول مین و بکا نہیں کرتا بلکہ ایک خطبۂ میت دے رہا ہے جس سے تھکی ہاری سپاہ اور ساتھیوں کا عزم نئے سرے سے بیدار ہوتا ہے۔ مسدس سے قطع نظر حالی کی شکوہ ہندی میں بصیرت رکھنے والوں کو وہ چیز نظر آئے گی جو مسلمانوں سے نہیں انسانیت سے اوجھل ہو گئی تھی، حالی نے مسلمانوں کے زوال کو انسانوں کا زوال منوایا ہے۔ حالی نے مسلمانوں کے جن فضائل کے زوال کا ماتم جس خلوص اور سطوت حزیں سے کیا ہے اس نے شکوۂ ہند کو دنیائے ادب کی عظیم المرتبت المیہ کے بہت قریب کر دیا ہے۔

حالی اور اکبر کا زمانہ ایک ہے لیکن دونوں کی شاعری کے حدود مختلف ہیں۔ حالی کے مد نظر اسلام اور مسلمان ہیں، اکبر مشرق اور مشرقیت کے نمائندہ ہیں۔ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کو مغربیت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہتے دیکھتے ہیں اور اپنی جیسی کر گزرتے ہیں۔ اکبر پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کو مغرب میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ مغرب سے نا واقف تھے۔ وہ مغرب کی سطحی باتوں کو اہمیت دیتے تھے۔ وہ قدیم کو ہر اعتبار سے مقدس و محترم گردانتے تھے۔ وہ عورتوں کی تعلیم کے خلاف تھے اور انگریزی تعلیم پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اکبر جس زمانہ میں تھے اس میں ہمارے بڑے سے بڑے صاحب فکر و نظر یوروپ کی اس نصیحت سے مرعوب تھے جو اکبر کو نظر آتی تھی۔ اس زمانہ کی مقتدر تصانیف سے پتہ چلتا ہے کہ اور تو اور ہم اپنے مذہب کو بھی اسی حد تک برحق یا قابل اعتبار سمجھتے تھے جس حد تک اس کی سند جواز مغرب کے اعمال و افکار میں ملتی تھی۔ اس زمانے میں بھی اکبر مغرب سے مرعوب نہ ہوئے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی بڑائی تسلیم کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ وہ لوگ جو مغرب سے پورے طور پر آشنا ہیں ان میں کتنے ایسے ہیں جو آج اسی دیار اکبر میں یورپ کی بڑائی ہر شعبۂ حیات میں تسلیم کرتے ہیں۔

اکبر کی مصطلحات شاعری ذرا سہرجن قسم کی ہیں۔ ان کے بدھو بناتی تنقیدی برہمنوں کو نہیں بھاتے، اکبر سیدھی بات بہت جلد بغیر کسی پیچ کے کہہ دیتے ہیں۔ اس سے شعر و ادب کے "اشراف و نقات" گھبراتے ہیں یہ رویہ یا نقطۂ نظر تنقید کی شریعت میں جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ پھر ہر شاعر کو اختیار ہے چاہے وہ کل سے جزو کا استنباط کرے چاہے جزو سے کل کا۔ اکبر ہی نہیں کوئی بڑا سے بڑا شاعر کو لیشن مٹری نہیں بنا سکتا۔ اس کے ہاں تضاد نہیں ہوتی۔ یعنی یہ بھی درست اور وہ بھی درست نہیں۔ شاعر کا یہ "ٹکنیک" نہیں ہوتا۔ یہ کام ہمارا آپ کا ہے کہ ہم شاعر کو جریب اور ترازو سے ناپنے کے بجائے اس کو سمجھنے اور چاہنے کے لیے ذوق ذہانت سے کام لیں۔

حالی کے زمانے میں ہونے کے باوجود نفسیاتی ترقی کے اعتبار سے اکبر ایک طور پر حالی سے آگے ہیں ہاں سودا کی ہجویات سے قطع نظر اکبر ہماری شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنھوں نے ہنسنے ہنسانے میں پہل کی ہے۔ یہ کام حالی کے عہد میں کسی اور کے بس کا نہ تھا۔

صاحبو! میری یہ گفتگو اب تک آپ کو غیر متعلق معلوم ہوئی ہوگی لیکن اقبال کا صحیح مقام متعین کرنے کے لیے ان مقامات سے گذرنا ضروری

تھا۔ گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ اقبال اب اس درجہ پر فائز ہیں جہاں یہ حکم لگانا بے محل نہ ہوگا کہ جو اقبال کا معتقد نہیں وہ خود بے بہرہ ہے۔ کوئی شاعر یا آرٹسٹ وسیع اور حقیقی معنوں میں شاعر یا آرٹسٹ نہیں ہے، اگر وہ سارے جہان کا شاعر یا آرٹسٹ نہ ہو۔ آپ اور میں اقبال کو مسلمان شاعر مانتے ہیں اور غلط نہیں مانتے۔ اور نہ ایسا سمجھنا اقبال ہی نہیں کسی بڑے شاعر کی شان کے منافی ہے۔ اقبال کو میں انہیں معنوں میں مسلمان شاعر مانتا ہوں جن معنوں میں اسلام کو سارے جہان کا مذہب سمجھتا ہوں۔ اگر رحمۃ اللعلمین سارے جہان کے لیے باعث رحمت ہیں تو ان کا نام لیوا، خواہ وہ شاعر ہو یا لیڈر سارے جہان کے لیے شاعر اور لیڈر ہوگا۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ ہم میں آپ میں جو لوگ اقبال سے ناواقف ہیں یا اقبال کے قایل نہیں ہیں وہ نہ صرف غیر تعلیم یافتہ ہیں بلکہ غیر متمدن بھی ہیں وہ شخص یقیناً تعلیم یافتہ یا متمدن نہیں کہا جا سکتا جو آفاق گیر شعرا یا آرٹسٹ کی عظمتوں سے ناآشنا ہو۔

شاعر، مفکر اور رہبر کی حیثیت سے اقبال کو ہمارے ادب اور زندگی میں وہ درجہ حاصل ہے جو آج تک مسلمانان ہند میں کسی اور شاعر اور مفکر یا ادیب کو حاصل نہیں ہوا، فرداً فرداً ممکن ہے ہمارے بعض شعرا کا پایہ اقبال سے برتر ہو لیکن بحیثیت مجموعی اقبال ہمارے اردو شعرا میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک نامعلوم طویل مدت تک اردو شاعری میں اقبال کی حیثیت خاتم الشعرا کی رہے تو تعجب نہیں، مذہب ہی نہیں شاعری میں بھی نبی اکثر گزرے ہیں اور گزرتے رہیں گے۔ رسول کم ہوئے ہیں۔

صاحبو! جب اقبال نے اپنا کلام و پیام ملک کے سامنے پیش کیا اور یہ ہمارے آپ کے سامنے کی بات ہے تو ہر طرف سے مخالفت کا طوفان اٹھا لیکن ان کی زندگی ہی میں وہ وقت بھی آگیا جب ہم میں کوئی ایسا نہیں ہے جو اقبال کا قائل نہ ہو۔ ہم ان کے کلام کو صوری و معنوی ہر صورت سے سراہتے ہیں اور ان کو سب سے بڑا شاعر اور مفکر گردانتے ہیں۔ دنیا کی بڑی ہستیوں کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ ابتدا میں ان کی شدید مخالفت کی جائے اور آخر میں ان پر جان نثار کی جائے۔ اردو میں ایک سے ایک بڑا شاعر مانا جاتا ہے مگر ہمارے ذہنوں پر اقبال کی جو عالمگیر گرفت ہے وہ کمتر کسی کے حصے میں آئی۔ یہاں تک کہ ہم میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اقبال کو خاصان خدا کے زمرے میں رکھتے ہیں۔

اردو شاعری میں فکر کا عنصر سب سے زیادہ غالب کے ہاں ملتا ہے۔ اردو میں غالب پہلے شاعر ہیں جنھوں نے شاعرانہ جذبہ میں مفکرانہ گہرائی پیدا کی۔ اس کا اعتراف خود اقبال نے کیا ہے۔ غالب کے عجمی تصورات سے یہاں بحث نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ فلسفیانہ مسائل کو فلسفیانہ شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کا سہرا غالب کے سر ہے۔ بعض غزلوں یا اشعار سے قطع نظر غالب کی زبان جہاں کہیں انھوں نے فکر و فلسفہ کو دخل دیا ہے علمی زبان بن گئی ہے۔ معتقدانہ شاعرانہ انداز میں شاعری کرنے کا امتیاز انیس و محسن کو حاصل ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ مرثیہ نگاروں میں انیس وہ ہیں جنھوں نے مرثیے کے زور سے اپنی شاعری کو نہیں بلکہ اپنی شاعری کے زور سے مرثیے کو چمکایا۔ زبان کے اعتبار سے انیس کو جو درجہ حاصل ہے وہ مسلم ہے لیکن یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ اردو بیشتر شاعرانہ زبان رہی ہے اس لیے ایسی شاعری میں جہاں خیالات سے زیادہ جذبات کی کارفرمائی ہو یہ خوب کام دیتی ہے اور یہی سبب ہے کہ جب کبھی اس میں ایسے عناصر داخل کیے گئے جو خالص شاعرانہ نہ تھے تو یہ ناہموار نظر آنے لگی ایسی ناہموار کہ اس کے پرستار اس شاعری کے بھی قائل نہ رہے جس نے اس میں اپنا کلام پیش کیا غالب اور حالی کا یہی حشر ہوا۔

صاحبو! اقبال کو بھی اس منزل سے گزرنا پڑا انیس کا یہ کمال تھا اور مرثیہ کی خوش بختی کہ انیس نے مرثیہ میں وہ ساری خوبیاں جمع کر دیں جو دیگر اصناف سخن میں علیحدہ علیحدہ موجود تھیں۔ ان کے کلام میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مسدس حتیٰ کہ ڈراما اور افسانہ سب کے خصوصی امتیاز بڑے دل کش اسلوب میں سمائے ہوئے ملتے ہیں۔ میر کے بعد انیس کو زبان پر جو قدرت تھی وہ آج تک نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔ اقبال کی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ میر و مومن کے مقابلے میں آپ اقبال کی زبان کو شاید ناقابل التفات سمجھیں لیکن یہاں زبان سے مراد صرف روزمرہ اور محاورہ اور اس قبیل کی باتیں نہیں ہیں بلکہ وہ زبان مدنظر ہے جو شاعر نے اپنے کلام میں مخصوص ضرورتوں کی بنا پر اختیار کی ہے اور کامیاب یا ناکامیاب رہا ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا کہ اگر آپ اس پر غور کریں کہ اقبال کا موضوع سخن کیا ہے۔ ان کا انداز تخاطب کیا ہے۔ ان کی ذہنی پرداخت کیسی اور ذہنی پرواز کس طرح تھی۔ ان کا مقصد کیا تھا اور ان کے مخاطب کون ہیں تو آپ اقبال کی زبان کے قائل ہو جائیں گے، مجھے تو اکثر محسوس ہوا ہے کہ جہاں تک مسائل علمیہ و فکریہ کو شعر میں ڈھال کر دل نشین اور فکر انگیز بنانے کا تعلق ہے۔ غالب کی زبان سے اقبال کی زبان زیادہ متوازن و شگفتہ ہے گو یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ اس وادی کے

کے کانٹے کا نکالنے کا کام غالب ہی نے کیا اور اس طرح اقبال کے لیے زمین ہموار اور صاف کی۔ روزمرّہ اور عام بول چال کی زبان سے یہاں بحث نہیں۔ اقبال کے ہاں اس زبان کا گذر نہیں، البتہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو جس ماہرانہ اور شاعرانہ انداز سے اپنے اردو کلام میں منتقل کیا ہے اس سے ہندوستان میں اردو اور فارسی دونوں کا وزن و وقار بڑھ گیا۔

صاحبو! اردو شعرا میں ایسے اصحاب بھی نظر آتے ہیں جو شاعری کے علاوہ دوسرے علوم و فنون پر بھی قدرت رکھتے تھے لیکن اس کا اثر ان کی شاعری پر بہت کم نظر آتا ہے۔ بعض شعرا علمی و فنی مصطلحات کی رعایت اپنے کلام میں ملحوظ رکھتے ہیں ہم اپنے حسن ظن سے ان کو اس علم و فن کا امام قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ شاعری اور اشعار پردازی کے پیچیدگیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی رعایت و مناسبت کا فن جاننے سے دور دور تک کا تعلق نہیں۔ یہ سارا کرشمہ ضلع جگت یا رعایات لفظی کا ہے جو ایک زمانے میں ہمارے شعر و ادب اور روزمرہ کی صحبتوں میں بہت مقبول تھے۔ یہی حال بڑی حد تک اردو شاعری میں تصوف کا ہے۔ اردو میں ایسے شعرا بہت کم گزرے ہیں جو واقعتاً تصوف سے لگاؤ رکھتے تھے یا جنھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا ہو، یہی سبب ہے کہ ہم کو اردو شاعری میں زبانی کھیل زیادہ ملتا ہے۔

صاحبو! ہم میں ایک غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ شاعری میں جذبہ ہی سب کچھ ہے۔ میں ایسے جذباتی شعرا سے واقف ہوں جو جذبہ کو خدا کی سب سے بڑی دین اور اپنا سب سے بڑا سرمایہ افتخار جانتے ہیں، جذبہ کو میں بھی خدا کی سب سے بڑی دین سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ وہ ہمارے شعرا کی شامت بھی بن گیا ہے۔ اگر غور فرمایئے تو معلوم ہو جائے گا کہ جذبہ بجائے خود کوئی بڑی بات نہیں ہے اگر اس کو حرکت میں لانے اور صحیح راستے پر لگانے کا ملکہ فکر و تجربہ نے شاعر کو نہ عطا کیا ہو۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے ایک متنازعہ فیہ مسئلہ کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی اقبال شاعر نہیں فلسفی ہیں، یا ان کی شاعری پر فلسفہ غالب ہے

میرے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اقبال کا درجہ (اور برگزیدہ شاعر کا درجہ) اس بحث سے کہیں بلند ہے کہ وہ شاعر پہلے ہیں فلسفی بعد میں یا اس کے برعکس بحیثیت مجموعی شاعری میرے نزدیک مخصوص پیرایۂ اظہار ہے نہ موضوع بحث، تمیز ہو تو فلسفہ سائنس، منطق وغیرہ کو بھی شاعری کا رنگ و آہنگ دیا جا سکتا ہے اور سلیقہ نہ ہو تو حسن و عشق کی بھی کوئی حیثیت نہیں۔ چنانچہ میرے نزدیک اقبال کا شاعر ہونا ان کے فلسفی ہونے کا منافی نہیں ہے۔ اسی طرح ان کے مفکر یا فلسفی ہونے سے ان کی شاعری کی منزلت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ نرا شاعر اور نری شاعری کا چسکا ہم کو غزل سے پڑا۔ یہاں تک کہ اکثر ہم غیر شعوری طور پر بھی یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ شاعری عبارت ہے غزل سے بعضوں کا خیال ہے کہ شاعری اور تغزل مترادف نہ سہی ان کا چولی دامن کا ضرور ساتھ ہے۔ شاعری کا یہ تصور اس اعتبار سے دلچسپ ہے کہ اس سے ہمارے تمدنی مزاج کی غمازی ہوتی ہے یعنی حسن و عشق تمامتر عبارت ہے عورت کے حسن سے۔

اقبال کا حسن و عشق اس سے علیحدہ بھی ہے، بلند بھی ہے اور شاید اس کا منافی بھی۔ لیکن اس بحث کو کسی دوسرے موقع کے لیے ملتوی کر دینا مناسب ہوگا۔ میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ اقبال کی عظمت کی نشانی ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کلام میں شاعر اور مفکر دونوں نظر آتے ہیں۔ مفکر اگر شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم اس کی بات سمجھ لیں یہ البتہ دشوار ہوگا کہ ہم اس کے کہے پر عمل بھی کریں اس طرح شاعر نہ ہو تو ممکن ہے ہم مشاعرے میں واہ واہ کر لیں تنہائی و تکلیف میں وہ ہمارا مونس یار رہبر نہ بن سکے گا۔ اردو شاعری میں خالص شاعر بھی گزرے ہیں۔ ان کی شاعری کو ہم اچھی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ بڑی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے یہاں اچھے شاعر بہت سے گزرے ہیں بڑے شاعر یقیناً بہت کم ہیں۔

صاحبو! اردو شاعری میں صرف اقبال کی شاعری ایسی ہے جو ہم کو ان علوم و مسائل تجربات و تحریکات کی طرف بے اختیار متوجہ کرتی ہے جو اس وقت عالمگیر ہیں اور جن کی گرفت عام اور تعلیم یافتہ ذہنوں پر ہے انھوں نے دنیا کے اکابر اصحاب فکر و عمل کے خیالات، تعلیمات و جد و جہد کو اپنے کلام کے ذریعے اس شاعرانہ لطف و ظرافت اور عالمانہ بصیرت و سنجیدگی سے پیش کیا کہ ہم ان کو اصحاب فکر سے ایک طرح ذہنی ربط پیدا ہو گیا اور اس طور پر ہم نہایت آسانی کے ساتھ ان تمام عالمگیر ذہنی تحریکوں سے آشنا ہوئے جن سے کسی اور طرح ہمارے عامۃ الناس روشناس نہ ہو سکتے تھے شاعری کا بڑا کمال اور اس کے لیے سب سے مستند سند جواز یہ ہے کہ وہ مشکل گہرے اور نازک تصورات و خیالات کو بہت جلد زیادہ سے زیادہ

دلوں میں اتار دیتی ہے اور یہ وہ کارنامہ ہے جو شاعری کے علاوہ کسی فن کو نصیب نہیں۔ اردو شاعری میں یہ بات صرف اقبال کے ہاں ملتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اقبال نے ان افکار و تحریکات کی خوبی اور خامیوں کو اسلامی افکار و اعمال کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جس سے ہمارے خواص و عوام دونوں گمراہ ہونے کے بجائے بہرہ مند ہوئے۔

سیاسی لیڈر تو ہم میں پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن ذہن و فکر کو طاقت و تازگی بخشنے اور صحیح راستے پر رہنمائی کرنے والا ہم میں عرصے سے نہیں پیدا ہوا تھا۔ آج کل مادی ترقی کے ساتھ ذہنی ترقی کی جو رفتار ہے اس سے عہدہ برآ ہونا معمولی ذہن و دماغ کا کام نہیں ہے۔ آجکل سیاسی قیادت جتنی آسان ہے اتنی ہی ذہنی قیادت مشکل ہے۔ سیاسی قیادت اکثر چند افراد اور محدود مقاصد کی بنا پر حاصل ہو جاتی ہے لیکن ذہنی قیادت ہر صدی میں صرف چند ایک کے حصہ میں آتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں میں ہمہ گیر ذہنی قیادت بہت کم لوگوں کے حصے میں آئی۔ یہ سعادت اور برگزیدگی اس صدی میں اقبال کو نصیب ہوئی۔ اقبال نے زندگی اور زمانے کے تقریباً تمام مسائل پر حکیمانہ شاعرانہ یا شاعرانہ حکیمانہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے اور کچھ ایسے دل کش اور موثر انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم میں ہر شخص خواہ وہ اس کے سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا ہو یا نہیں ان مسائل کو سمجھنے سلجھانے کی کوشش کرتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو خوش ہوتا ہے اور نہیں کامیاب یا مطمئن ہونے کی بار بار کوشش کرتا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اقبال کے وسیلے سے قوائے علمیہ و عملیہ کس طرح بیدار و بالیدہ ہوتے ہیں۔ اقبال کے کلام کی مثال اس متاع یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہل ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سی روئی لے کر بازار مصر میں آموجود ہوئی تھی۔ آپ سوچیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال کی اس کرامت کا عام ذہنی نشوونما اور ذہنی حوصلوں پر کیسا عظیم الشان اثر ہے۔

صاحبو! اسلام نے اپنے پیروؤں کو دین و دنیا کی ان منزلتوں پر فائز کر دیا تھا جن سے آگے یا جن سے بڑی کوئی اور منزلت نہ تھی۔ دنیا کی کوئی ترقی یا ذہن و عمل کا کوئی کارنامہ ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو سر اسیمہ یا متحیر کر سکتا۔ مسلمانوں پر ایسا وقت بھی آیا جب وہ منزلت سے گر کر مذلت میں جا پڑے اور اس تصور لے کہ وہ سب کچھ تھے یا کر سکتے تھے لیکن کرتے کچھ نہ تھے ان کو شدید نقصان بھی پہنچا یا، یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں ہم نے ہر طرح کے جتن کیے لیکن شعور کی وہ بیداری جس کو ہم افراد کی نہیں جماعت کی بیداری سے تعبیر کر سکتے مدتوں نصیب نہ ہوئی، مغربی اداروں اور مغربی افکار سے ہم مسحور و مرعوب ہوتے رہے۔ یہ حال عوام ہی کا نہیں تھا بلکہ ہمارے خواص بھی اس کے شکار تھے۔ ہماری اکثر مستند تصانیف اور مشیر ادارے اس پر گواہ ہیں اقبال کے کلام کی گرمی اور تازگی ان کی تعلیم کی گیرائی اور گہرائی اور ان کے بے پایاں خلوص سے ہمارے دلوں کے معلوم نہیں کب سے خشک سوتے ابل پڑے اور کھیت سوئے ہوئے ساز نغمہ سرا ہو گئے، ہندی مسلمانوں میں جو یہ جہت بیداری آج نظر آ رہی ہے اس کو جو نام چاہے دے لیجیے، یہ کرامت اقبال ہی کی ہے جس کے لیے انیس و غالب، حالی و اکبر، سرسید و شبلی نے زمین ہموار کر رکھی تھی۔

صاحبو! اقبال سے پہلے مسلمان تعلیم یافتہ طبقہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو واجب العمل سمجھنا تو درکنار ان کو تحریر و تقریر میں بطور سند پیش کرنا اپنی اور دوسرے کی ذہنی توہین سمجھتا تھا۔ یہ طبقہ اسلاف و اکابر کی روایات اور مذہبی و اخلاقی قدروں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اردو شعر و ادب کو دوسرے شعر و ادب کے مقابلے میں ہیچ سمجھتا تھا۔ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئی ہو مستند اور مشرق کا ہر تصور و تصویر مردود تھی۔ اقبال کے کلام و پیام نے ہمارے قلب و دماغ کی یکسر قلب ماہیت کر دی۔ اب کسی بحث میں اقبال کا کلام یا ان کے متفرق اشعار کو بطور دلیل پیش کرنا عام بات ہے بعض فروعی باتوں سے قطع نظر اقبال نے وہی چیزیں پیش کی ہیں جو پہلے سے ہمارے ہاں موجود تھیں لیکن نیا ذہن ان کی طرف مائل نہ ہوتا تھا۔ اقبال کی تعلیم کی بنیاد قرآن و حدیث، ائمہ کے اقوال اور اسلاف کے کارناموں پر مشتمل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن اقبال نے ان باتوں کو جس قابلیت خلوص اور جرأت کے ساتھ پیش کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم خود اپنی نظروں میں محترم ہو گئے، اور اس طور پر محترم بنے کے کہ دوسرے ہم کو محترم ماننے پر مجبور ہوئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شاعری اور پیمبری کی حدود نہ صرف ایک دوسرے سے مل گئی ہیں بلکہ کچھ دور تک ایک ساتھ چل گئی ہیں۔

صاحبو! ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اقبال کو مفکرین یورپ کا خوشہ چیں قرار دیتے ہیں۔ یہ غلطی نہیں تو غلط فہمی ضرور ہے۔ یہی نہیں بلکہ

آج کل بعض حلقوں میں یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ خود اسلام اپنے پیشرو مذاہب سے ماخوذ ہے یا ان کا خوشہ چیں ہے، اسی سلسلے میں ایک بات یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اقبال نے جو بات کہیں بھی مفید مطلب پائی اختیار کر لی اور باقی کو ترک کر دیا یہ سارے اعتراضات تسلیم کر لینے چاہئیں۔ یہ اعتراضات بڑی حد تک اسلامی تصورات کی تصدیق کرتے ہیں نہ کہ تکذیب، واقعات صحیح ہیں صرف ان سے نتیجہ غلط نکالا گیا ہے۔ اسلام نے اس کا کہیں اور کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ دنیا کی تاریخی و تمدنی آثار و کسر انکسار سے یکسر محفوظ و علیحدہ رہ کر ایک دن یک لخت آسمان سے نازل ہو گیا وہ حمل دوسرے ادیان کا ناسخ بھی ہے اور تصدیق کرنے والا بھی۔ ناسخ اس لیے کہ اسلام دین کامل قرار دیا گیا اُس ہستی کے توسل سے جو اسلام کا مرد کامل ہے اور اس طاقت نے اس کو کامل قرار دیا جس سے بڑی طاقت انسانی تصور میں نہیں آسکتی اور تصدیق کرنے والا یوں کہ وہ ان ادیان کو جھٹلاتا نہیں بلکہ ان کے بنیادی تصورات کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے اسلام میں اگر وہ باتیں ملیں جو اس سے پہلے کے ادیان میں ملتی ہیں تو اس میں شرمانے، خفا یا مایوس ہونے کی کیا بات ہے۔ اس سے اسلام کا درجہ فروتر کیوں کر ہوا؟ کلام الٰہی یا مذہب الٰہی کے یہ معنی کب ہوئے کہ دنیا کے حالات و حوادث سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو، بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ اس دنیا کا خدا اسی دنیا کے ماضی حال و مستقبل سے بیگانہ نہیں ہے اس لیے کہ دنیا کی تاریخ تقدیر الٰہی سے باہر نہیں۔

صاحبو! اس بحث کی روشنی میں اگر ہم یہ مان لیں کہ اقبال نے مفکرین یورپ سے استفادہ کیا تو اس میں کیا قباحت لازم آتی ہے اور اقبال نے مفکرین یورپ کی انہیں باتوں سے سروکار رکھا ہو جو ان کے کلام و پیام کی تائید و تصدیق کرتے ہوں (بقیہ سے نہیں) تو کیا قباحت لازم آتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں آپ کو اس مسئلہ پر بھی غور کرنے کی دعوت دوں گا کہ مفکرین یورپ کے اکثر بنیادی تصورات ان اسلامیوں کے تصرفات ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ یورپ پہنچے تو یورپ کے مفکرین کے بارے میں آپ کیا رائے قائم کریں گے یہ بحث بڑی طولانی ہے اس صحبت میں میں صرف اقبال کو مدنظر رکھنا چاہتا ہوں اقبال نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان پر فلاسفہ مغرب کا کافی اثر تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اقبال نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ مغربی مفکرین کے مطالعہ سے پہلے وہ ان اسلامی تصورات و عقائد سے بھی پورے طور پر بہرہ مند تھے جو کلام پاک کے مطالعہ کا نتیجہ تھے۔ میرے نزدیک ان دونوں بیانات میں تضاد نہیں ہے کیا اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ اقبال مغربی مفکرین سے متاثر ہی اس لیے ہوئے کہ ان کے ذہن و دماغ میں وہ اسلامی تصورات رچے ہوئے تھے جو انسانی ذہن و عمل کو انسانی ارتقا کی اس وادی سے لے جاتے ہیں جس کا ایک سرا اسلاد آدم سے وابستہ ہے اور دوسرا معراج آدم میں پوشیدہ۔

صاحبو! اس بحث میں گفتگو کی گنجایش ہے لیکن وقت میں گنجایش نہ ہونے کے سبب سے میں اس مسئلہ کو یہاں ختم کر دینا چاہتا ہوں اور اپنے ان نوجوان دوستوں کو جو اقبال کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مشورہ دوں گا کہ وہ اقبال کے بنیادی تصورات کو ذہن میں رکھ کر کلام پاک کا مطالعہ کریں۔ ان کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال پر قرآن کا اثر مغربی مفکرین کے اثر سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور اقبال کو مغربی مفکرین کے تصورات سے دلچسپی ہی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے تصورات کلام الٰہی سے ہم آہنگ ہیں اور اقبال ان مفکرین کے اسی حد تک ہمنوا ہیں جس حد تک قرآن پاک سے ان تصورات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ہمارے ایک عزیز ذی استعداد طالب علم نے اس پر کام کرنے کا تہیہ کر لیا ہے کچھ تعجب نہیں آئندہ سال یوم اقبال کے موقع پر سرور صاحب کی معرفت آپ اس طالب علم کے اس مقالہ سے اسی ایوان میں آشنا ہوں۔

بعضوں کے نزدیک اقبال کے ہاں جہاں تہاں منطقی الجھنیں ملتی ہیں۔ خودی اور خدائی کے حدود واضح نہیں ہیں۔ فوق البشر کا تصور کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ۔ وہ کبھی کسی ادارے یا شخصیت کی تعریف کرتے ہیں اور کبھی اس سے روگرداں ہو جاتے ہیں اور اس قبیل کی دوسری باتیں۔ لیکن یہ امور ایسے نہیں ہیں جن کی اہمیت اقبال کی عظمت پر غالب آسکے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں خدا کی قدرت کا سب سے بڑا نمونہ انسان ہے اور انسان ہی وہ باشعور مخلوق ہے جو باعتبار خلقت اپنے خالق سے بہت قریب کا رشتہ رکھتا ہے اور یہ رشتہ زندگی کا ہے اس زندگی کا جو ہمیشگی سے پیوستہ ہے جو اجل ہوتی رہتی ہے معدوم نہیں ہوتی۔ یہ زندگی خدا سے شروع ہوتی اور خدا پر ہی ختم ہو جاتی ہے انسانی زندگی کبھی اس سے باہر نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی خودی ہمیشہ انسانی خودی رہے گی اور اس کی خودی کی معراج اس پر نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے بلکہ خدا کی صفات سے قریب تر ہو کر مرفع تر و مستحکم تر ہوتی رہے۔ انسان کے خدا بن جانے میں میرے نزدیک انسان کی کوئی بڑائی نہیں ہے اس لیے کہ انسان کا خدا بن جانا انسانیت

کے مقاصد میں نہیں ہے۔ استحکام خودی سے اقبال کا مقصد یہی ہے کہ وہ کسی ذات میں ختم نہ ہو۔ انسانی خودی کی انتہا صرف انسانی خودی کی انتہا ہے کسی ...ر کی ابتدا یا انتہا نہیں۔

صاحبو، یہ مسائل علمی نقطۂ نظر سے اہم ہوں تو ہوں مذہبی نقطہ نظر سے ان کی کوئی اہمیت نہیں اس لیے کہ مذہب اس بحث سے بلند بھی ہے اور علیحدہ بھی۔ دراصل اسلام میں کوئی فلسفہ نہیں ہے۔ اسلام کا مدار چند بنیادی عقائد پر ہے اس کے بعد ان عقائد کے ماتحت تمام تر عمل پر ہے۔ بذات خود میں سمجھتا ہوں کہ عقائد کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ وہ سائنس، فلسفہ اور ریاضی کی کسوٹی پر صحیح اتریں، عقائد کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ سائنٹیفک ہونا بالکل ضروری نہیں ہے۔ فلسفہ دراصل مذہب کا گورستان ہے۔ دنیا کے مذاہب پر جو زوال آیا وہ غالباً اسی سبب سے ہے کہ ان میں فلسفہ کے جراثیم موجود تھے۔ اگر اسلام مذہب عمل نہ ہوتا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و شخصیت کو اس درجہ اہمیت نہ دی جاتی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے شجر اسلام میں نمی دمی ہے یہی سبب ہے کہ اسلام پر برے سے برا وقت آیا لیکن اس پر کہولت یا فرسودگی طاری نہیں ہوئی۔ انسانی جہد و عمل کا مذہب کبھی فرسودہ نہیں ہوا۔ درس خودی میں اقبال اسی جہد پیہم پر زور دیتے ہیں جس میں "محبت فاتح عالم" بھی شامل ہوتی ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اقبال کے بیانات میں تضاد ملتا ہے۔ اس کے بارے میں صرف یہ کہنا کہ اسلام کے ندا کی طرح اسلام اور اسلام کے شاعر میں بھی مختلف حیثیتیں مختلف مواقع پر برسر کار آتی ہیں۔ اسلامی سیرت و شخصیت میں "پولاد" و "پرنیاں" دونوں ملتی ہیں۔ ضرب کاری بھی اور خوئے دلنوازی بھی۔ لیکن اس بحث کو یہاں ختم کر دینا چاہیے۔ بہت ممکن ہے آج کی صحبت میں کسی گوشے سے ان پر تفصیلی گفتگو سننے میں آئے۔

صاحبو! میں نے اقبال کا کلام پڑھا ہے۔ بار بار پڑھا ہے ہر حال میں پڑھا ہے، (پھر بھی سرور صاحب سے کم پڑھا ہے) مجھے ہمیشہ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اقبال کا کلام اس آسمان کی مانند ہے جس کے نیچے ہم آپ بستے ہیں۔ جاڑے گرمی، برسات میں اس فضائے نیلی پر کیسے کیسے سماں نظر آتے ہیں جو کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ جن میں زندگی کی بوقلمونی نظر آتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو برسات میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس بساط پر کیسی کیسی نیرنگیاں نظر آتی ہیں اور آپ کے ذہن میں کیسی کیسی رنگین پراسرار ڈراتے والی، تسکین دینے والی حوصلہ دلانے والی تصویریں اور تصورات جیسے جیتے جاگتے، ہنستے بولتے "دم بدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" جلوہ گر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے کشمیر کی زمین و آسمان جن کو جب دیکھیے، جتنا دیکھیے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور محسوس ہوگی جو پہلے نہ ہوئی تھی!

صاحبو! آپ کو یاد ہوگا: میں نے عرض کیا تھا کہ اقبال کا کلام و پیام ہماری زندگی کی سرگرمیوں میں غیر معمولی طور پر دخیل ہے۔ اقبال کے کلام و پیام سے مسلمانان ہند میں ایک جدید نشاۃ الثانیہ کی ابتدا ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کا کونسا شعبہ ایسا ہے جہاں اقبال کے کلام و پیام سے ہم کو مکمل رہبری نہیں ملتی۔ ان کے فلسفہ نے نئے علم کلام کا دروازہ کھولا، شعر و ادب میں نئی قدریں سامنے آئیں۔ تعلیمی مسائل میں اقبال کے کلام سے روشنی اور گرمی دونوں ملتی ہیں، ہمارے آپ کے پروفیسر سیدین نے کچھ دن ہوئے ایک مبسوط تصنیف میں اقبال کے ان نظریوں کو پیش کیا ہے جو تعلیم کی اساس مانے جاتے ہیں، ہماری موجودہ سیاسی تگ و تاز میں اقبال کے کلام کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کی شیرازہ بندی میں اقبال کی تعلیم نے وہ کام کیا جو اب تک پورا نہ ہوا تھا، اقبال ہی کے تصور سے ہم کو اپنے علمی و تمدنی ورثہ کی عظمت کا احساس ہوا اور قومی شعور کی صحیح راستہ پر نشوونما ہوئی۔ اقبال کے کلام و پیام سے مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ اور حضرت اسمٰعیل شہید کے کارناموں کو از نو تازگی و تابندگی ملی۔

ہمارے ادب میں اتنا جامع حیثیات شاعر اب تک نہیں پیدا ہوا جو بیک وقت اپنی قوم میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا معلم و مفکر تھا۔ اس کی یادگار منانا اور اس کے بتائے ہوئے راستے کو اختیار کرنا سعادت مندی بھی ہے اور اقبال مندی بھی؛ خدا آپ کی مدد کرے۔

چھیڑ غالب سے چلی جائے

غالب کی زندگی کو مزاحیہ رنگ اور ڈرامے کے روپ میں بے حد دل چسپ انداز سے پیش کرنے والی یہ کتاب اپنے ڈھنگ کی اکلوتی کتاب ہے۔ قیمت ۵ روپے

نگار بک ایجنسی رامپور۔ یوپی

اقبال کا فکری ارتقار

محمد عبدالسلام خاں

ظروف اور ذہنی فعالی

واردات انسانی فکر کی صورت میں ہوں یا وجدان کی شکل میں۔ ان میں ماضی کے تجربے، مستقبل کے تقاضے اور موجودہ ظروف و احوال کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج کے فلسفیانہ نظام، سائنسی اکتشاف اور جمالیاتی اظہار ہزاروں سال پہلے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہوتے اور ہمارے حصے میں بزرگوں کے ورثے کی حفاظت کے سوا کچھ آتا تاہم یہی سب کچھ نہیں ہیں فرد کا شخصی تاثر اور اس کی ذہنی صلاحیت، شخصیت کی ذاتی فعالی اور تاثیر ناگزیر عامل ہیں ان واردات کی آمد، صورت پذیری اور ظہور میں۔ ورنہ یکساں ظروف میں ہر شخص افلاطون و ارسطو ہوتا، ہر فرد ایڈیسن اور اسٹیفنسن بنتا، غالب اور اقبال میں کوئی ندرت نہ ہوتی۔

اقبال کی حکیمانہ فکر اور فلسفیانہ نظام میں بے شبہ دانایان مغرب اور حکمار مشرق دونوں کے افکار کا نمایاں اثر ہے۔ مغرب کے مادی ارتقا کو بھی دخل ہے اور مشرق کی زوال آمادہ ثقافت سے اثر پذیری کو بھی۔ ان کی فکر میں اسلامی دنیا کے ہر جہتی انحطاط کا عموماً اور ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی کا خصوصاً ایک مقام ہے۔ امت مسلمہ کی رفعت کی عام آرزو خود بھی ایک محرک ہے۔

فکر اقبال کے ظروف

اقبال کا گھریلو صوفیانہ مذہبی ماحول اور ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت، مکتبی اور مدرسی مضامین اور اساتذہ کی صحبتیں ان کی فکر کو ایک خاص سمت میں ڈال دینے کی ذمہ دار ہیں۔ ہندوستان کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی عصبیتوں اور فرنگی استعمار کی سیاست کاریوں کو بھی ان کی فکری تعمیر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ پنجاب کی صحت بخش آب و ہوا، جسمانی طاقتوں اور ان کو بڑھانے کے وسائل سے دل چسپی، قوت کے مظاہرے اور اقبال کی ان سے عملی دل چسپی ان سب کا ایک طرح سے اثر ہے ان کے خیالات کے میلان میں۔

اُنیسویں صدی کے ربع آخر میں مغرب کی مادی قوتوں کا ہندوستان پر کامل استیلار اور اس کے افکار و تصورات کی قوت قدیم تہذیب کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذہبی عقائد اور ان کی دینی روایات کو بھی متزلزل کیے ہوئے تھے۔ سرسید مرحوم کے اعتذاری مباحث اور اجتہادی انتقادوں نے بڑی حد تک اس تزلزل پر نظری طور سے قابو پانے کی کوشش کی۔ سرسید کی ان بحثوں اور تنقیدوں کا علمی فائدہ یہ ہوا کہ مذہبی مباحث کی تحقیقات میں جو جمود پیدا ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا اور مجتہدانہ نظر و بحث کے لیے نئے رستے کھل گئے۔ شبلی اسکول نے ان آزاد بحثوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ شبلی اور ان کے رفقار اور شاگردوں کے علم و فضل، اعتدال پسندی، عمق اور ثقاہت نے اس اعتذاری لے کو بہت ہلکا کر دیا اور بے روک ٹوک اجتہاد کی بندش کی۔ مولانا آزاد مرحوم نے قرآنی صداقتوں کو اور مسلم کرداروں کو علمی ماحول میں جس اچھوتے خطیبانہ انداز میں پیش کیا، اس نے ان میں نئی زندگی بھر دی۔ اسی فضا کی ایک عظیم شخصیت خود اقبال بھی تھے۔

یہ احوال و ظروف کتنے ہی موثر سہی لیکن ان سے اقبال کی فکر کی کامل توجیہ نہیں ہوتی۔ ایک خاص رخ سے معلومات و محسوسات کا انتخاب جمع، جائزہ، ترتیب اور استنباط کسی خاص جذبے یا جذبات کے رہین منت ہو سکتے ہیں لیکن خود اقبال کی اپنی ذہنی ساخت اور اس کی فعالی اُن کے نظام فکر کی تشکیل میں سب سے اہم عامل ہے۔ دوسری چیزوں کی حیثیت محرکات سے زیادہ نہیں۔

اقبال کا نشوونما اور تعلیم و تربیت

اقبال جو اس عہد کے ایک عظیم مفکر تھے ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو سیالکوٹ کے ایک

ایسے متوسط الحال اور پیشہ ور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں صوفیانہ خیالات اور بزرگوں کی کشف و کرامات کا خاصا چرچا تھا۔ شریعت و طریقت کے اسرار و رموز سے دلچسپی تھی۔

اقبال نے مکتبی تعلیم جس میں فارسی ادبیات کے اوسط اور عربی کے ابتدائی مروجہ نصاب تک کی کتابیں شامل تھیں، کسی ٹھیٹ ملائے مکتبی کے بجائے قصبے کے روشن خیال، صوفی منش، جدید تعلیم کے ہمدرد اور سرسید اور ان کی تعلیمی تحریک سے دلچسپی رکھنے والی اثر انداز شخصیت مولوی میر حسن شاہ کے پاس پائی۔ ان بزرگ کی نگرانی اور تعلیم و تربیت میں رہتے ہوئے ان کی ہدایت پر ہی اقبال اسکاچ مشن ہائی اسکول میں (جو بعد میں اسکاچ مشن کالج ہوگیا تھا) داخل ہوگئے اور وہیں سے ۱۸۹۳ء میں انٹرنس کیا۔ اسی زمانے میں اقبال کی پہلی شادی ہوئی لیکن باہم خوشگوار تعلقات قائم نہیں ہوسکے اور شادی کے باب میں اقبال کی جو خوش آیند توقعات ہونگی وہ برنہ آسکیں۔ بہرحال اِن ازدواجی علائق کے ساتھ ہی ۱۸۹۵ء میں اقبال نے اسی کالج سے ایف اے کرلیا۔

مکتب و مدرسہ کی قید و بند کے باوجود اقبال لڑکپن کے عام شوقوں میں آزادانہ حصہ لیتے تھے۔ کبوتربازی، بٹیربازی ان کے مرغوب شغل تھے۔ پنجاب کے متوسط گھرانوں کے نوعمروں کی طرح ڈنڈ پیلنا، مگدر ہلانا اور اکھاڑوں میں زور کرنا اقبال کے دلچسپ مشاغل تھے۔ شعر و شاعری سے لگاؤ فطری تھا طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ سیالکوٹ میں جو چھوٹے موٹے مشاعرے ہوتے ان میں شریک ہوتے اور اپنی غزلیں پڑھتے۔ داغ کو اُستادی کے لیے اقبال نے اسی زمانے میں انتخاب کیا تھا۔

۱۸۹۵ء میں اقبال لاہور آگئے اور ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے عربی ادب اور فلسفہ لے کر امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کیا۔ ۱۸۹۹ء میں علی گڑھ کالج کے مشہور استاد، پریچنگ آف اسلام کے مصنف آرنلڈ اور شبلی کے دوست اور استاد پروفیسر آرنلڈ کے شاگرد خاص کی حیثیت میں گورنمنٹ کالج سے ہی فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ لاہور میں رہ کر اقبال کا ذوق شاعری خوب نکھر گیا۔ غالباً ۱۸۹۵ء کی بات ہے کہ لاہور کے ایک مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوئے اور غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:

تم آزماؤ ہاں کو زباں سے نکال کے　　یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ وصال کے

اسی غزل میں وہ مشہور شعر بھی تھا جس پر مرزا ارشد گورگانی عش عش کر گئے تھے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے　　قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس زمانے کی شاعری میں اگر ایک طرف مجازی عشق سے دل بہلایا ہے تو دوسری طرف صوفیانہ واردات کو بھی نظم کیا ہے عشق حقیقی کی چاشنی بھی ہے۔ تاہم مذہبی کرداروں سے شیفتگی، دینی روایات سے محبت اور ملت اسلامیہ سے گہری وابستگی ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی ابتدا کے چند سال ہندستان کی سیاسی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں یہی وہ زمانہ تھا کہ ہندستانی قومیت میں اختلاف و افتراق کی خلیج وسیع ہوتی جارہی تھی۔ فرقہ پرورانہ مطالبوں اور ان کے ردعمل سے سیاسی فضا مکدر تھی۔ جمہوری خطوط پر قومی حقوق طلبی کی جدوجہد اور حکومت کے نظم و نسق اور اس کی حکمت عملی پر عوامی نقطہ نگاہ سے نقد و نظر کو مسلمانوں کا سربرآوردہ طبقہ اپنے فرقہ وارانہ مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ خاص طور سے یوپی اور بہار کے مسلمان وطنی تحریکوں کے خلاف صف آرا تھے۔ جن صوبوں میں مسلمان غیر معمولی اقلیت میں تھے یا اپنی ایک گونہ اکثریت کی وجہ سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے تھے۔ ان کا انداز نظر بدلا ہوا تھا۔ عام مسلمان کشمکش میں مبتلا تھے۔ جذبات کی رو میں کہیں قومیت کے خلاف صف آرا ہوجاتے کبھی شانہ بہ شانہ برادران وطن کے ساتھ نظر آتے۔ مسلمانوں کی کوئی مستقل، مستحکم اور مرکزی پالیسی نہ تھی۔ علی گڑھ قیادت سے آزاد جدید تعلیم یافتہ نوجوان اس افتراق و اختلاف سے متنفر تھا اور چاہتا تھا کہ ہندو مسلمان ایک جان اور دو قالب ہوکر خالص وطنی بنیادوں پر اپنی سیاسی جدوجہد کو استوار کریں اور نفرت و اختلاف کو قومیت متحدہ کے وسیع مفاد میں محو کردیں۔

اقبال کا اس زمانے میں یہی رجحان تھا۔ چنانچہ ملت سے پوری وابستگی، مذہبی روایات سے پوری شیفتگی اور ملی کرداروں سے پوری عقیدت کے باوجود انھوں نے قومی جذبات سے معمور نظمیں لکھیں جن میں ملکی روایتوں، قومی کرداروں اور وطنی علامتوں سے والہانہ دلچسپی کا اظہار تھا۔ اور وطنیت و قومیت کو فرقہ وارانہ اتحاد کی بنیاد بنا کر متحدہ قومیت کی طرف دعوت دی تھی۔ آفتاب۔ ایک آرزو۔ ترانۂ ہندی۔ نیا شوالہ

ہندوستانی بچوں کا گیت اور تصویر درد جیسی نظمیں وطنیت و قومیت کے جذبات سے معمور دل کی پکار ہیں۔ نالۂ یتیم، یتیم کا خطاب۔ خط منظوم۔ عرض بحضور حضرت نظام الدین اولیاء۔ ہلال عید اور سپاس جناب امیر وغیرہ نظمیں بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ ان نظموں میں مذہبی تلمیحات کے ساتھ ملی روایات سے عشق، اسلامی کرداروں سے والہانہ تعلق پوری شدت سے موجود ہے۔

ایم اے کر چکنے کے بعد اقبال سب سے پہلے اورنٹیل کالج لاہور میں عربی کے استاد ہو گئے اور غالباً عربی درسیات کے مضامین، تاریخ فلسفہ وغیرہ کا درس ان سے متعلق ہو گیا اور عربی، فارسی، اردو، ہندی اور سنسکرت کی درسیات کے اساتذہ کی رفاقت میں انھوں نے تعلیمی کام انجام دینا شروع کر دیا۔ کچھ مدت بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں جہاں آرنلڈ تھے اقبال بھی فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو گئے اور ۱۹۰۵ء تک وہ اسی اسامی پر رہے۔

اقبال کا مذہبی تصوّر اور وطنیت

اس عہد کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مذہب کے ہر جہتی اصول زندگی ہونے اور اجتماعی و انفرادی تمام شعبہائے حیات کے لیے اس کے شیرازہ بند ہونے کے تصور تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہب ایک باطنی لگاؤ، روحانی تعلق اور قلبی لطیفہ ہے جس سے انسانی جذبات میں لطافت اور تقدس پیدا ہو جاتا ہے۔ سارے عالم سے یگانگی اور دوستی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ عام خلوص ہمدردی اور محبت اس کے لوازم ہیں۔ دل آزاری اور شکوہ سنجی اس کی روح کے خلاف ہیں۔ 'التجائے مسافر' میں التجا ہے:

مری زبان قلم سے کسی کا دل نہ دکھے — کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجکو

مذہب کا نچوڑ محبت ہے۔ 'سپاس امیر' میں "انا مدینۃ العلم و علی بابہا" کو سامنے رکھتے ہوئے محبت کو اصل اصول قرار دے کر حضرت علیؓ کو خطاب کرتے ہیں:

اے باب مدینۂ محبت — اے نوح سفینۂ محبت
اے مذہب عشق را نمازے — اے سینۂ تو امین رازے

'فریاد امت' میں اسلام کی حقیقت کی اس طرح توضیح کرتے ہیں:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

مذاہب کا اختلاف ایک ہی حقیقت کے مختلف رخ ہیں ان میں باطنی تضاد یا تصادم نہیں۔

اصل محبوب ازل کی ہیں یہ تدبیریں سبھی — ایک بیاض نظم ہستی کی ہیں تصویریں سبھی

آنکھ مل جاتی ہے ہفتاد و دو ملت سے تری — ایک پیمانہ ترا سارے زمانے کے لیے

اقبال کی اس متصوفانہ مذہبیت کا تقاضا ہے صلح کل اور عام دعوت اتحاد۔ افتراق و اختلاف سے نفرت:

تو جدائی پہ جان دیتا ہے — وصل کی راہ دیکھتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے — اس عبادت کو کیا سراہوں میں
میں کسی کو برا کہوں تو بہ — ساری دنیا سے خود برا ہوں میں

'فریاد امت' میں واعظوں پر نکتہ چینی کرتے ہیں:

غیر بھی ہو تو اسے چاہیے اچھا کہنا — پر غضب ہے کہ یہ اپنوں کو برا کہتے ہیں

اس روحانی لطیفے اور باطنی مقدس حرارت کا کوئی متعین عملی تقاضا نہیں، کوئی خاص بندھی ٹکی ثقافت نہیں، خاص صورتوں اور خاص رسموں میں محدود نہیں، اس کے اپنے نپے تلے مطالبے نہیں اس لیے اس کا نہ کسی قومیت سے تصادم ہے نہ کسی نظام سے:

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسان کی
کچھ اسی کے دم سے قایم شان ہے انسان کی

روح کا جوبن نکھرتا ہے اسی تدبیر سے
آدمی سونے کا بن جاتا ہے اس اکسیر سے

رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خون آبائی رگ تن سے نکل سکتا نہیں

چنانچہ اقبال ترانۂ ہندی میں اعلان کرتے ہیں:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

نیا شوالہ میں اختلاف و افتراق کی خلیج اس طرح پاٹتے ہیں:

زنّار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں شان حرم دکھا دیں

مندر میں ہو بلاتا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں میں ناقوس کو چھپا دیں

اگتی ہے ایک نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

مذہب کا یہ تصور کچھ تو اس دور کے عام جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے مذاق طبع کا آئینہ دار ہے جو خاص طور سے اس کے عملی تقاضوں اور شعائر و رسوم کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور ایک بہت نجی معاملہ سمجھ کر اس کی باطنیت اور روحانیت کو ہی سب کچھ جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ایران کے عام صوفی شعراء کے کلام سے حقیقی مذہب کا جو دل آویز اور روحانی تصور ماخوذ ہوتا ہے اس کی سرمستی اور سرجوشی کو چھوڑ کر اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جب ہر شے میں ایک ہی ازلی ابدی حسن کی جھلک ہے۔ بلبل کی چہک کی دوسری صورت گل کی مہک ہے۔ غنچے کی چٹک کا دوسرا نام انسان کا سخن ہے۔ جگنو کی چمک سوز ہے اور مرغ خوشنوا کا نغمہ ساز تو پھر تسبیح زنار کی دوسری صورت کیوں نہ ہو۔ اذان ناقوس ہی کی صدا کیسے نہ ہو۔ حقیقت کا یہ شاعرانہ تخیل، وجود کا یہ جمالیاتی تصور، تہذیبوں کی آویزشوں اور نصب العینوں کے تصادموں کے لیے جس طرح کوئی گنجایش نہیں چھوڑتا اسی طرح مذاہب کی ہنگامہ آرائیوں کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں مہیا کرتا۔

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشی ازل ہو

اقبال اور جستجو

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کا یہ تصور اور مابعد الطبیعیاتی حقایق کی عام مذہبی توجیہیں اقبال کے دل و دماغ کو مطمئن نہ کر سکیں چنانچہ آغوش مذہب میں پرورش پایا ہوا اور بزرگوں کی عقیدت مندیوں کے گہوارے میں جھولا ہوا، شاعرانہ احساسات سے معمور، ذوق و وجدان کی وسعتوں سے روشناس، مغربی فلسفے کا یہ نوجوان طالب علم جب کائنات پر نظر ڈالتا ہے تو اس کی فلسفیانہ فکر سراپا استفسار و جستجو بن جاتی ہے۔ وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہے کہ آیا اس ہنگامۂ بود و نابود کا کوئی مقصد ہے یا یہ جمع و تالیف اور شکست و ریخت محض عناصر کا کھیل ہے؟ کبھی ہمالہ سے پوچھتا ہے:

اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دست قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے

---

۱ حسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے، غنچے میں وہ چٹک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوے بلبل، بو پھول کی مہک ہے

کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

پرندے اور جگنو کا مکالمہ ہے۔ جگنو کی زبان میں:

چمک بخشی مجھے آواز تجھ کو
دیا ہے سوز مجھ کو، ساز تجھ کو

مخالف ساز کا ہوتا نہیں سوز
جہاں میں ساز کا ہے ہم نشیں سوز

کبھی گل رنگین سے سوال ہوتا ہے کہ "راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے"۔ اگر واقعی یہ عالم رنگ و بو کوئی بامقصد اور سوچا سمجھا کارنامہ ہے تو پھر چیزوں میں ہم آہنگی اور توافق کیوں نہیں۔ اس رزمگاہ اضداد کی کیا توجیہہ ہے۔ اگر اس عالم سے ماورا بھی کوئی جہان ہے تو وہ کیا ہے اور کیسا ہے اور کیا وہ بھی ناآہنگی کا شکار اور اضداد کی آماجگاہ ہے؟ "خفتگان خاک سے" استفسار کرتا ہے:

اے مئے غفلت کے سرمستو! کہاں رہتے ہو تم — کچھ کہو اس دیس کی آخر جہاں رہتے ہو تم
وہ بھی حیرت خانۂ امروز و فردا ہے کوئی — اور پیکار عناصر کا تماشا ہے کوئی
آدمی واں بھی حصار غم میں ہے محصور کیا — اس ولایت میں ہے انساں کا دل مجبور کیا
واں بھی جل مرتا ہے سوز شمع پر پروانہ کیا — اس چمن میں بھی گل و بلبل کا ہے افسانہ کیا
رشتہ و پیوند جاں کے جان کا آزار ہیں — اس گلستاں میں بھی کیا ایسے نکیلے خار ہیں
اس جہاں میں ایک معیشت اور سو افتاد ہے — روح کیا اس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے — قافلے والے بھی ہیں؟ اندیشۂ رہزن بھی ہے

پھر اس تضاد اور ناآہنگی کے دور ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ چنانچہ "آفتاب صبح" میں اپنی اس آرزو کو بیان کیا ہے:

دیدۂ باطن پہ راز نظم قدرت ہو عیاں — ہو شناسائے فلک شمع تخیل کا دھواں
عقدۂ اضداد کی کاوش نہ تڑپائے مجھے — حسن عشق انگیز ہر شے میں نظر آئے مجھے

پھر کائنات کی سب سے دل چسپ اور دل آویز مخلوق انسان کی کہاں سے ابتدا ہے اور کونسی اس کی منزل ہے:

کوئی اب تک نہ یہ سمجھا کہ انساں — کہاں جاتا ہے، آتا ہے کہاں سے

پھر انسان جو اپنی ساخت اور استعداد صلاحیت کے اعتبار سے قدرت کا شہکار ہے کیا واقعی اس کی قسمت نیستی ہے؟

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے — موت اک چبھتا ہوا کانٹا دل انساں میں ہے

اگر موت عدم محض نہیں ہے فقط انتقال مکانی ہے تو یہ انتقال تدریج کے بجائے دفعتاً کیوں ہے؟

کیا عوض رفتار کے اس دیس میں پرواز ہے — موت کہتے ہیں جسے اہل زمیں کیا راز ہے

اس دوسری زندگی کی تشخیص و تعبیر میں جنت و دوزخ کے حوالے کا مفہوم کیا ہے، ان کی کیا حقیقت ہے، کیا توجیہہ ہے؟

باغ ہے فردوس یا اک منزل آرام ہے — یا رخ بے پردۂ حسن ازل کا نام ہے
کیا جہنم معصیت سوزی کی اک ترکیب ہے — آگ کے شعلوں میں پنہاں مقصد تادیب ہے

اگر یہاں ہمارا علم حقیقتوں تک پہنچنے کے قابل نہیں تو کیا اس زمان و مکان سے آزاد عالم میں اس کی یہ محدودیت ختم ہو جائیگی اور ہم حقیقتوں کو براہ راست محسوس کر سکیں گے یا یہی جستجو اور استفہام ہماری تقدیر ہے؟

اضطراب دل کا ساماں یاں کی ہست و بود ہے — علم انساں اس ولایت میں بھی کیا محدود ہے
دید سے تسکین پاتا ہے دل مہجور بھی — لن ترانی کہہ رہے ہیں یا وہاں کے طور بھی
جستجو میں ہے وہاں بھی روح کو آرام کیا — واں بھی انساں ہے قتیل ذوق استفہام کیا

اقبال کے سلسلے میں یہ سوالات محض شاعرانہ تخیل آفرینی یا وقتی لطیف احساسات نہیں جن کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ان کے پیچھے منطقی فکر ہے، مستقل دل کی کرید ہے۔ دماغ کی مسلسل الجھن ہے۔ تصوف اور فلسفہ کی آویزش ہے۔ عقیدے اور استدلال کی کشمکش ہے اور مادیت اور روحانیت کا تصادم ہے۔ چنانچہ ان کے پورے کلام پر نظر ڈال جاؤ۔ ان کے عمر بھر کے فلسفے کا جائزہ لے لو وہ ان ہی سوالوں کے گرد گھومتے نظر آئیں گے۔ ان کی پختہ فکر اور فلسفیانہ نظر مذہبی عقائد اور صوفیانہ شعور کے سہارے خالص مادی ماحول میں ان ہی سوالوں کا جواب دیتی

ہوئی نظر آئے گی۔ ایک خاص میلان کے تحت ان کے آئندہ نظام فلسفہ کے لیے منتشر نقطے اور دھندلے خطوط ان سوالوں کی روشنی ہی میں متشکل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ وسائل علم اور ذرایع معرفت کی تنقیح اور انتخاب شروع ہو جاتا ہے۔

حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ

خود اصل کائنات کا جہاں تک تعلق ہے ان کے شاعرانہ وجدان اور متصوفانہ شعور نے اس کی ہستی کے راز کو اسی زمانے میں ان پر بے نقاب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کائنات اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کے مسلسل اور متواتر تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے؟ طبیعی اسباب و علل زیادہ سے زیادہ اتفاق اور مصاحبت تک پہنچاتے ہیں۔ ان کو دائمی مان لو لیکن یہ کیوں ہیں، کہاں سے آئے ہیں، اس کا جواب عقل کے پاس کہاں تھا۔ عقل مشاہدات و محسوسات سے تجرید و تعمیم کے ذریعے کلیات کا استخراج کر لے لیکن وہ محسوسات تک ہی تو محدود ہوں گے۔ محسوسات سے ماورا اور ان کی پشت پر اگر کوئی اندرونی واقعیت ہے تو اس کی اصل حقیقت اور پھر اس حقیقت کے ذاتی لوازم اور بلاواسطہ اوصاف اگر کچھ ہوں تو وہ عقل و فکر کی گرفت میں کیسے آتے۔ عقل و فکر کا خام مواد وہ احساسات اور ارتسامات ہیں جنکو حواس معروض کی ظہوری حیثیت سے اخذ کرتے ہیں عقل اپنے اصول و ضوابط کے تحت انھیں مرتب و منظم کرتی ہے۔ لیکن کسی معین معروض کے عقلی تصور کے لیے صرف انھیں احساسات اور ارتسامات کی ترتیب و تنظیم کافی نہیں جو حواس نے کسی خاص وقت میں اس معین معروض کے کسی خاص رخ اور خاص مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہیں بلکہ دوسرے گزشتہ ادقات کے اور دوسرے رخوں اور دوسری مکانی نسبتوں سے اخذ کیے ہوئے احساسات اور ارتسامات سب اس خاص زمانی اور خاص مکانی ارتسام کے ساتھ شامل ہو کر عقل کا خام مواد ہیں جن کو عقل مرتب اور منظم کر کے کسی معین معروض کا تصور مکمل کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہنا چاہیے کہ کسی معروض کے عقلی تصور کے لیے کوئی خاص متعین زمانی اور مکانی ارتسام کافی نہیں بلکہ گزشتہ زمانی اور مکانی تجربات کے تحت معروض کو مجموعی طور سے جیسا ہونا چاہیے۔ اس کو ٹھیک ویسا ہونا چاہیے

غرض یہ کہ عقل کا عمل ظواہر پر ہوتا ہے، اصل حقیقت جو ظواہر کی تہہ میں ہے، وہ اس کی گرفت سے باہر ہوتی ہے اس لیے عرفان حقیقت اس کے حدود کار سے بہت بلند ہے۔ وہ زمان و مکان کی حدود کے تحت فکر کرتی ہے جن کا اصل حقیقت پر اطلاق نہیں ہوتا محض اس اصول کے پیش نظر کہ ہر اثر کے لیے اثر آفرین اور معلول کے لیے علت درکار ہے، وہ زیادہ سے زیادہ حقیقت کے دروازے تک پہنچ سکتی ہے لیکن خود حقیقت یا حقائق اپنی اندرونی حیثیت میں اس اصول کے تحت ہیں یا اس اصول کا اطلاق ان پر نہیں ہوتا، اس پر عقل کوئی روشنی نہیں ڈالتی۔ وہ تو صرف ظواہر کا یا دوسرے لفظوں میں معروضات کا اپنے طریقوں اور اپنے شروط کے ساتھ جائزہ لے سکتی ہے مگر خود حقیقت کو اس کی واقعی نوعیت کو، اس کے حقیقی لوازم و اوصاف کو، ظواہر کے ساتھ اس کے تعلق کو اگر کچھ ہو تو، پھر اس تعلق کی نوعیت کو کسی طرح نہیں محسوس کر سکتی۔[1]

حقیقت کو دریافت کر لینے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو براہ راست محسوس کیا جائے۔ جب حقیقت خود محسوس ہو جائے گی تو شاید کائنات سے متعلق وہ کیا ہے، کیوں ہے، اس کے تغیرات کی بنیادی علت کیا ہے، اور کب سے اور کہاں ہے، جیسے سوالات کا جواب خود بخود ہی واضح ہو جائے گا۔ لیکن کیا اس کو براہ راست محسوس کرنا ممکن بھی ہے۔ اقبال کا جواب غالباً صوفیانہ مشاہدات کو سامنے رکھتے ہوئے، یہ ہے کہ ممکن ہے بلکہ واقعہ ہے۔ اقبال دل کو براہ راست احساس حقیقت کا منصب دیتے ہیں۔ دل سے اقبال کی مراد غالباً وہ مقدس الٰہی لطیفہ ہے جو انسانی ظواہر میں بحیثیت باطن ذات یا حقیقت انسانیہ کے پوشیدہ ہے اور یہی محل ہے تجلیات الٰہیہ کا دل کے براہ راست محسوس کرنے کی ہی دوسری تعبیر وجدان ہے۔ اقبال عقل کے ادراک اور دل کے مشاہدے کا فرق اور عقل کے حدود اور قیود اور

---

[1] عقل کے دائرہ عمل اور طریق کار کی تشریح میں کانٹ کے زاویۂ نظر کو پس منظر کے طور پر بالقصد سامنے رکھا گیا ہے۔ مجھے برگسانی انداز نظر کی تائید میں اقبال کے اس عہد کے کلام میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔

اس کے مقابلے میں دل کی آزادی کو بیان کرتے ہیں:

راز ہستی کو تو سمجھتی ہے — اور آنکھوں سے دیکھتا ہوں میں
ہے تجھے واسطہ مظاہر سے — اور باطن کو دیکھتا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے — تو خدا جو، خدا نما ہوں میں
شمع تو محفل صداقت کی — حسن کی بزم کا دیا ہوں میں
تو زمان و مکان سے رشتہ بپا — طائر سدرہ آشنا ہوں میں
کس بلندی پہ ہے مقام مرا — عرش رب جلیل کا ہوں میں

11 MAY 1963

شاید عقل کی اس "مظاہر وابستگی" اور "زمان و مکان سے رشتہ بپائی" کا انکشاف اور دل کی اس باطن بینی اور "سدرہ آشنائی" کا شعور ہی تمہید ہے اقبال کے "شمشیر ذوق جستجو" کے زخموں کے اندمال کی ابتدا کا اور "دیدہ دری" کے رستے میں گرم سیر ہونے کا۔

اقبال اور وحدت وجود

دل یا انسان کی باطنی ذات عقل کے واسطے کے بغیر اصل حقیقت کو خود بخود محسوس کرتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ واقعتہً ایک ہی حقیقت ہے جو انسان بھی ہے اور واقعیت بھی۔ کسی چیز کے براہ راست شعور کے لیے معروض شعور اور شاعر کو ایک ہونا چاہیئے یا ایک دوسرے کا براہ راست وصف ہو یا دونوں کسی تیسری ذات کے براہ راست اوصاف ہوں۔ آخری دونوں صورتوں کا مآل بھی یہی ہے کہ محل اور موصوف یا ذات اور بطن ایک ہی حقیقت ہے جو حامل ہے متعدد اوصاف اور اعتبارات کی غرض یہ کہ دل کی باطن بینی اور انفس و آفاق کی وحدت لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اقبال نے اپنے اس ابتدائی دور میں جہاں دل کی باطن بینی اور معرفت پر زور دیا وہاں انفس اور آفاق کی اندرونی وحدت یا دوسرے لفظوں میں نظریۂ وحدت وجود کی بھی حمایت کی جو کسی نہ کسی حیثیت میں آخر تک ان کے فلسفے کا بنیادی عنصر رہا۔

۱۹۰۵ء تک کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقبال کے سامنے 'وحدت وجود' کا کوئی متعین اور مستند نظریہ اپنی تفصیلوں اور عقلی توجیہوں کے ساتھ نہ تھا۔ ان کا وحدت وجود کا تصور غالباً ان منتشر معلومات پر مبنی تھا جو مختلف ماخذوں اور متعدد مکاتیب سے ماخوذ تھے۔ اس میں نہ ناقدانہ انتخاب ہے نہ عالمانہ ترتیب و تعمیر۔ یہ بھی بعید نہیں کہ اردو، فارسی اور ہندی شعرا کے متفرق صوفیانہ کلام نے خاص طور سے اس باب میں ان کی رہنمائی کی ہو۔ بہرحال ان کے اس عہد کے تصور میں کسی فلسفیانہ گہرائی یا براہ راست صوفیانہ احساس کو بہت کم دخل ہے تاہم انھوں نے اپنی "امتیاز دیر و حرم میں پھنسی ہوئی" فکر کو اس دلدل سے نکالنے کی کوشش کی ہے اور اپنے "سیمابی جوش اضطراب" کو ٹھنڈا کرنے کی ایک راہ نکالی ہے، یہ علم کی بے تابی کو تسکین دینے کے لیے ایک شاعرانہ تخیل ہے جس میں متعدد مکاتب خیال کے خاص خاص نقطے، ان کے عقلی نتائج کو سامنے رکھے بغیر شامل ہیں۔[1]

---

[1] یوں تو کثرت کی وحدت سے توجیہ، مشرقی مفکرین کا ہی امتیاز نہیں فلاسفہ مغرب میں، قدیم یونانیوں میں بھی وحدت وجود کے حامی رہے ہیں اور یورپ کے جدید حکماء میں بھی متعدد اہل فکر کا یہی میلان رہا ہے۔ میں یہاں صرف شنکراچاریہ اور ابن عربی کے نظریوں کی تلخیص پر اکتفا کر رہا ہوں۔ آئندہ چل کر اقبال نے بھی انہیں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی مشرق کے مشہور نظریے ہیں جو خواص ہی نہیں بلکہ عوام تک پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ اور اقبال کے تصور میں بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ ان ہی دونوں کا اثر ہے۔ شنکراچاریہ کے نزدیک واقعی حقیقت صرف برہما ہے۔ برہما اپنی ذات کے اعتبار سے ازلاً ابداً یکساں ہے۔ ہر قسم کی دوئی سے منزہ۔ صور اور اشکال سے ماورا، ہر قسم کے تعین اور آمیزش سے بری۔ صرف ذہن محض، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے برتر شعور محض، سکون خالص۔

کائنات اپنی تمام جزئیات اور پوری تفاصیل کے ساتھ برہما کی مظہری صورت ہے۔ اس ظہور کی علت اور اس کا محل اور ہیولیٰ بھی خود برہما ہی ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی ہستی نہیں۔ عالم یا یہ مظہری کثرت عملی اور کاروباری واقعیت کے طور پر موجود ہے، ذہنی تخیلات اور خواب کے محسوسات سے بالکل مختلف اور جدا۔

برہما کی اس مظہری ہستی یا کثرت میں اور انسانی "انا" کی مظہری ہستی میں تلازم ہے۔ جب تک مظہری "انا" اپنی مظہری شخصیت کو قائم رکھے ہوئے ہے ربانی

اس زمانے کی مشہور نظم "شمع" اور بعض دوسرے متفرق اشعار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے نزدیک حقیقت اور واقعیت صرف ایک ہے جس میں خالق اور مخلوق، علت اور معلول یا کائنات اور مکوّن کا فرق نہیں۔ یہ جیسی تھی ویسی ہے۔ ایک ہی تھی اور ایک ہی ہے یہ ظاہری کثرت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ اس کثرت کا واقعی فرد ہے اور کثرت اس کے لیے واقعی حقیقت ہے۔ اس کی یہی مظہری واقعیت بنیاد ہے اس کے سماجی تعلقات کی اور اسی پر مدار ہے اس کے مذہبی فرائض و واجبات کا۔ اعمال اور ان کے اثرات کی واقعیت اسی مظہری ہستی سے مشروط ہے۔

لیکن یہ کثرت واقعۃً حقیقی نہیں۔ اس کی بنیاد محض بے علمی یا جہالت ہے۔ جوں ہی اصل حقیقت کا عرفان ہوا کہ "تو ہی ہے" اور "انا" حقیقتاً خود ہی برہما ہے تو یہ کثرت غایب ہوئی۔ اب نہ اعمال ہیں نہ ان کے اثرات، نہ تعلقات ہیں نہ متعلقین فقط برہما ہی برہما ہے؛ ایک اور یکساں، جب تک جہالت رہتی ہے اور حقیقت کا عرفان نہیں ہوتا "میں" میں رہتا ہوں اور "تو" تو۔ جہالت رفع ہوئی تو نہ تو تو ہے نہ میں میں: صرف برہما ہے؛ ہر قسم کی کثرت اور ہر طرح کے تعلقات سے مقدس؛ بے صورت، بے قید، حقیقت خالص اور شعور محض۔

یہ عدم عرفان یا جہالت شخصی تو ہے ہی لیکن چوں کہ پوری مظہری کائنات کی بنیاد ہے اس لیے عالمی یا کائناتی بھی ہے اور چونکہ پوری مظہری کائنات اصل حقیقت کے اعتبار سے برہما ہی برہما ہے اس لیے یہ جہالت یا عدم عرفان بھی برہما ہی ہے اور مظہری کائنات کی طرح خود بھی عملی اور کاروباری واقعیت ہے لیکن چوں کہ اصل عرفان کے ساتھ یہ فنا ہو جاتی ہے اس لیے بے حقیقت اور لاشئی محض ہے۔ حقیقت تو وہی ہے جو لازوال ہے۔ گویا کائنات یا یہ کثرت نتیجہ ہے جہالت کا جو بے حقیقت اور بے بود ہے اور برہما کا جو حقیقت ہے اور ہست۔

ابن عربی کے نزدیک ذات یا حقیقت صرف ایک ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی حقیقت نہ کوئی وجود۔ ذاتی حیثیت میں یہ حقیقت مجہول المکنہ اور مبہم ہے، ہر قسم کی قیود اور ہر طرح کے تعینات سے ماورا، خود ابہام اور اطلاق بھی اس کے لیے قید نہیں۔ تمام افعال اور اسماء و صفات سے بالاتر۔ ازلیت اور ابدیت سے بھی برتر۔ ہستی یا مصدری وجود بھی ایک تعین ہے اور اپنی اس حیثیت میں ذات تعینات سے بلند ہے۔ ناقابل تعبیر ہے، بے عنوان اور بے اسم غیب مکمل بغیر فعلیت و ظہور۔

یہ حقیقت متعدد تنزلات یا درجات کے لحاظ کے بعد سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تنزل ایک طرح کے تعین ہیں چنانچہ سب سے پہلا تعین وجود ہے دوسرے تمام اوصاف اور تعینات سے معرّا۔ یہ ذات کا وجود ہے اور صرف ذات کے لیے۔ ہر قسم کے علم و ادراک سے ماورا۔ حقیقت کا یہ وجودی تعین منشا ہے اس کے علمی تنزل کا۔ موجودہ حقیقت جو اپنی تمام صلاحیتوں، قوتوں اور امکانات پر مشتمل ہے، علم ذات کا موضوع ہے۔ ذات کا یہ عرفان خود اپنے آپ کا عرفان ہے جو شامل ہے ذات کی متمیز اور متعین حیثیت کے علم کو اور اپنے تمام متمیز متعین امکانات اور صلاحیتوں اور قوتوں کے علم کو۔ ذات کا یہی علمی تعین مبدأ ہے اس کی علیت کا۔ بہرحال ذات کی یہ اندرونی صلاحیتیں ایک دوسرے لحاظ سے ظاہر عالم کی حقیقتیں ہیں۔ جن میں ظاہر کے تمام امکانات شامل ہیں۔ یہ صلاحیتیں جو علم حق میں اپنے کیفی امتیاز کے ساتھ ازلاً ابداً ثابت ہیں "اعیان ثابتہ" کہلاتی ہیں۔ ذات حقہ اپنے امکانات کے علم کے ساتھ مبدأ ہے ان امکانات کے ظہور کا۔ ان امکانات کا ظہور جو ظہور ہے کائنات کا، ذات حقہ کا ظہوری تنزل ہے۔ یہ ظہور جس طرح تقاضا ہے ذات کا اسی طرح خود یہ امکانات یا اعیان ثابتہ بھی اپنے ظہور کے متقاضی ہیں۔ ذات کے تقاضائے ظہور کی منشا محبت یا عشق ہے اس حب ظہور کا پہلا مطلوب ظرف ظہور کا حصول ہے۔ یہ ظرف ظہور جس میں اشیاء اپنی امکانی یا درجاتی ترتیب سے ظاہر ہوتی رہتی ہیں ظہور اشیاء سے پہلے محض ممکن وہمی اور خیالی خلاء ہے۔ عماء کہلاتا ہے۔ ذات کے ظہوری تنزل کے معنی ہیں اس کے امکانات کا جو دوسری حیثیت میں ظاہر عالم کے امکانات یا اعیان ثابتہ ہیں، ظاہر اور مشہود ہو جانا۔ یہ امکانات علم حق سے قطع نظر غیر متمیز استعداد ہے جو مادہ ہے عالمی کثرت کا، چنانچہ شیخ اس کو "ہباء" کا نام دیتے ہیں۔

ہباء استعداد امکان ہے ذات حقہ کا۔ اس کی حقیقت ذات حقہ کے علاوہ کچھ نہیں، اس کی ہستی کے معنی ہیں ذات کی ہستی اس کے ظہور کا مفہوم ہے صرف ذات کا ظہور ہے۔ ذات کے ظاہر ہونے کا مطلب اتنا ہی ہے کہ قوتیں فعلیتیں ہو جائیں۔ ذات کی کسی فعلیت کا نمودار ہونا ذات کا اس طرح موجود ہونا ہے کہ اس سے ایک خاص انداز نمودار ہو۔ مثلاً زید کی کسی استعداد جیسے قیام کی سکت، قعود کی سکت یا لکھنے پڑھنے کی سکت کے عملی حقیقت بن جانے کے

(باقی اگلے صفحہ پر)

جس کو کائنات یا عالم کہا جاتا ہے ہمارے اپنے شعور اور آگہی کا ساختہ ہے، حقیقت میں نہ "من" ہے نہ "تو" ہے نہ کوئی بلند ہے نہ پست، نہ کہیں مہک ہے نہ کہیں "مستی"

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بیقرار — خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیاز رفعت و پستی اسی سے ہے — گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی — اصل کشاکش 'من' و 'تو' ہے یہ آگہی

اگر یہ شعور و آگہی فنا ہو جائے تو یہ تمام تعینات ختم ہو جائیں اور وہی ازلی اور ابدی حقیقت رہ جائے جس میں من و تو کا کوئی فرق نہیں:

آزاد دست برد بقا و فنا ہوں میں — کشتہ ہو یہ شرار تو کیا جانے کیا ہوں میں

یہ مجہول الکنہ حقیقت جو وحدت صرف ہے بے چندگی اور اطلاق محض ہے بے تعین، عرفان ذات کی خواہاں اور نمود کی متقاضی ہے۔ ذات کا یہ تقاضائے نمود، حقیقت کی یہ خواہش عرفان علت ہے کثرت کی اور سبب ہے ظہور کائنات کا۔ یہ تقاضائے نمود یا عشق نظارگی دعوت بے حجابی ہوتی ہے۔ اور تعینات اور امتیازات نمایاں ہو جاتے ہیں؛ وحدت کثرت نظر آنے لگتی ہے اور دعوت بے حجابی کو مہمیز کرتی ہے:

صبح ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق — آواز کن ہوئی تپش آموز جان عشق

اب خواہش دید پیدا ہو گئی، چشم شعور وا ہونے لگی:

یہ حکم تھا کہ گلشنِ کن کی بہار دیکھ — ایک آشیانے کے خواب پریشاں ہزار دیکھ

ذات کا مرتبۂ اطلاق و ابہام وجود سے برتر اور شعور و آگہی سے ماورا ہے۔ ہستی ہی صید شعور و آگہی ہے۔ ہستی وہ کائنات کی ہو یا حقیقت مطلقہ کی بنیاد ہے تعین و امتیاز کی، اساس ہے تعلق اور وابستگی کی تیدکی۔ ہستی سے جہان ذات متعین اور متمیز ہوتی ہے۔ وہیں اشیاء یا کثرت اور کائنات باہم دگر بھی اور خود اصل حقیقت سے بھی متمیز ہو جاتی ہے اور متعین وحدتیں ظہور پذیر ہو جاتی ہیں؛ من و تو میں فرق ہو جاتا ہے بلندی اور پستی ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ گل میں مہک اور شراب میں مستی صاف محسوس ہونے لگتی ہے۔ گل و بلبل اور شمع و پروانہ حسن و عشق کے الگ الگ موضوع دکھنے لگتے ہیں؛ ہستی کا یہ پردہ سب کو جدا جدا کر دیتا ہے۔ الگ الگ قیدی اور الگ الگ قفس۔ حقیقت سے دور ہر ایک اپنے اپنے غمکدے میں غربت کے دن گزارتا رہتا ہے:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی — شام فراق، صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیب درخت طور مرا آشیانہ تھا
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معنی یہی ہیں کہ زید ایک ایسے انداز اور ایسی وضع میں موجود ہے کہ دیکھنے والا اس کو کھڑا بیٹھا یا لکھتا ہوا، پڑھتا ہوا محسوس کرے۔ کھڑے ہونے بیٹھے ہونے، یا لکھنے پڑھنے کی نہ تو کوئی الگ ہستی ہے اور نہ ان کی کوئی الگ حقیقت ہے۔ چنانچہ یہ ہیولیٰ یا استعداد محض فعلیت اختیار کرتی ہے اور ذات حق کی شہودی تجلی کا محل بن جاتی ہے تو کائنات یا کثرت نمایاں ہو جاتی ہے۔ گویا کائنات ذات باری کا اپنا ایک خاص انداز وجود ہے اور بس۔ یہ شے کے نزدیک کائنات اپنی نوعی حیثیت میں قدیم ہے۔ ذات حق ازلاً اور ابداً موجود ہے اور اس کی موجودگی کے لیے کوئی نہ کوئی انداز وجود ضروری ہے۔ اس کا یہ انداز وجود اس کے کسی نہ کسی امکان کا ظہور ہے اور ہر امکان کا ظہور کسی نہ کسی فعلیت کی نمود ہے۔ یہی فعلیت کوئی نہ کوئی شے ہے۔ اور یہ سلسلہ ازل سے ابد تک برابر جاری ہے۔

ابن عربی کے نزدیک اگرچہ کائنات کی اپنی الگ کوئی حقیقت نہیں اور نہ اس کا کوئی اپنا الگ وجود ہے تاہم وہ حقیقی اور واقعی ہے نہ کوئی دھوکہ ہے نہ کوئی التباس اور فریب۔ ذات باری سے بھی ممتاز و ماسوا کی کثرت باہم بھی ممتاز، ایک دوسرے سے الگ، ہر شے خود ہی شے ہے نہ کہ دوسری۔

ہستی کا سراپا جستجو ہونا، رازِ حقیقت کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرنا حقیقت سے اسی غیر شعوری تعلق کے غماز ہیں:

یادِ وطن فسردگی بے سبب بنی　　شوقِ نظر کبھی کبھی ذوقِ طلب بنی

من و تو کا یہ فرق، گل و بلبل کا یہ امتیاز، شمع و پروانہ کی یہ تشخیص، گلشن کن کی یہ بہار کیا سچ مچ واقعی ہے؟ کیا حسن و عشق حقیقتاً الگ الگ ہیں؟ عالم کی یہ کثرت کیا حقیقی کثرت ہے؟ اقبال کہتے ہیں کہ یہ سب فریبِ نظر ہے جس کو شعور و آگہی کی غفلت آفرینی نے اپنے اظہار کے لیے گھڑ لیا ہے:

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے　　عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

ورنہ صرف ایک ہی مقدس اور متعالی حقیقت ہے، ان سب فریبوں سے ماورا، یہاں تو "محمود" ہے اور بس "ایازی" جہالت کا اختراع ہے:

محمود، اپنے آپ کو سمجھا ایاز ہے　　کیا غفلت آفریں یہ مئے غازہ ساز ہے

شعورِ غفلت آفریں اور آگہی غلط نگر کا یہ کائناتی سلسلہ، زمان بردوش اور امکان در آغوش حقیقت کے گلے کا طوق بن گیا اور حقیقت مطلقہ صید و صیاد میں اور حلقۂ دام و بامِ حرم میں حد احد المحصور ہو گئی ورنہ واقع میں نہ کوئی پہلے ہے نہ بعد، نہ یہاں ہے نہ وہاں۔ وہ تنہا ایک حقیقت ہے جس کو چاہو ناز کہہ دو چاہو نیاز نام رکھ دو؛ ناز نیاز ہے اور نیاز ناز، ظاہر باطن ہے اور باطن ظاہر:

یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے　　طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے

منزل کا اشتیاق ہے، گم کردہ راہ ہوں　　اے شمع! میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں

صیاد آپ حلقۂ دام ستم بھی آپ　　بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں　　کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ راز کہیں کہیں　　پھر چھڑ نہ جائے قصہ دار و رسن کہیں

اس شعور و آگہی کا سبب، جس کی غلط نگاہی سے حقیقت حد احد تعینوں اور امتیازوں میں مقید ہو جاتی ہے خود ہستی ہے اس لیے حقیقت کے بے قید وحدت اور بے تعین اطلاق کے لیے اس ہستی کا فنا ہونا ضروری ہے:

میری ہستی نے رکھا مجھ سے تجھے پوشیدہ　　پھر تری راہ میں اس کو نہ مٹاؤں کیوں کر

گویا شخصیت کا نصب العین اور "انا" کا مطمحِ نظر خودی کو فنا کرنا ہے نہ کہ اس کو باقی رکھنا:

میری ہستی ہی جو تھی میری نظر کا پردہ　　اٹھ گیا بزم سے میں پردہ محفل ہو کر

عینِ ہستی ہوا ہستی کا فنا ہو جانا　　حق دکھایا مجھے اس نقطے نے باطل ہو کر

اقبال کے اس شاعرانہ "وحدت وجود" کا غالباً حاصل یہ ہے کہ صرف ایک ہی حقیقت ہے بے قید، بے امتیاز؛ اس کی اندرونی ذات اپنی خواہش عرفان کے تحت ظہور کی متقاضی ہے۔ یہ مظہری وجود یا کثرت اسی تقاضے کا جواب ہے۔ وہ شعور خالص جو خود ذات ہے اور ذات کا ہے اور صرف ذات کے لیے ہے۔ مظہری صورت میں وحدت کو جدا جدا اور زمانی، مکانی تعینوں میں دیکھنے لگتا ہے لیکن جس طرح حقیقت کا یہ رخ محض مظہری ہے اندرونی اور باطنی واقعیت نہیں، اسی طرح شعور کی یہ گرفت بھی اندرونی اور باطنی حقیقت کی گرفت نہیں۔ یہ مظہری ہستی باطل یا نظر انداز ہوئی اور اصل حقیقت سامنے آئی تو پھر وحدت ہی وحدت رہ جاتی ہے؛ بے امتیاز اور بے تعین۔ خود شعور کا بھی یہ غیر واقعی انداز ختم ہو جاتا ہے۔ اب حقیقت ہی حقیقت محسوس ہوتی ہے، "تو"، فنا ہو جاتا ہے اور "میں" ہی "میں" رہ جاتا ہے۔

نہ صہبا ہوں نہ ساقی ہوں نہ مستی ہوں نہ پیمانہ　　میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

اس زمانے کے کلام پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعرانہ وحدت وجود کا اقبال کی فکر پر خاص اثر نہ تھا؛ نہ وہ زندگی کی کشمکش سے بھاگنا چاہتے تھے نہ ان کے

زندگی سے فرار کی خواہش اور وحدت وجود

یہاں معاشرتی تعلقات سے گریز کی تلقین ہے نہ وہ ظواہر سے بچ کر گزرنا چاہتے ہیں نہ باطن ہی باطن کی تلقین کرتے ہیں نہ ان کے کلام سے کسی ہمہ گیر انقعالی دل چسپی کا احساس ہوتا ہے۔ "ایک آرزو" میں کوئی شبہ نہیں کہ زندگی سے فرار، عزلت گزینی کی غیر معمولی خواہش، مظاہر قدرت سے انفعالی دل چسپی نمایاں ہے:

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا — ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو
مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری — دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو
آزاد فکر سے ہوں، عزلت میں دن گزاروں — دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو
لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں — چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا — ساغر ذرا سا گویا مجھکو جہاں نما ہو

لیکن اس کے لہجے میں سنجیدگی اور طمانیت نہیں، آرزو میں خلوص اور طلب میں سچی تڑپ نہیں ہے بلکہ جھنجلاہٹ ہے مایوسی کا وقتی ردعمل ہے، ناکامی کا غصہ ہے۔ اہل وطن کی بے حسی کا ماتم ہے۔ چنانچہ اسی نظم کے دوسرے بند کے اشعار ہیں:

شمشاد گل کا بیری، گل یاسمن کا دشمن — ہو آشیاں کے قابل یہ وہ چمن نہیں ہے
اپنوں کو غیر سمجھوں اس سرزمیں میں رہ کر — میں بے وطن ہوں میرا کوئی وطن نہیں ہے
وہ مے نہیں کہ جس کی تاثیر تھی محبت — ساقی نہیں وہ باقی وہ انجمن نہیں ہے

اہل وطن کا یہی اختلاف اور افتراق تھا جس سے فلسفی اقبال کا نہیں بلکہ شاعر اقبال کا دل بجھ گیا اور وہ نت نئے ہنگاموں سے اکتا اٹھا:

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب — کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

اور اس کو مذہب سے تعلق کے باوجود ملا اور پنڈت دونوں سے دل چسپی نہیں رہی:

پچھلے پہر کی کوئل وہ صبح کی مؤذن — میں اس کا ہمنوا ہوں وہ میری ہمنوا ہو
کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں — روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

لیکن اس پر بھی ان کے دل کی تمنا یہی ہے کہ:

ہر درد مند دل کو رونا مرا رلا دے — بیہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

اقبال کا میلان طبع

اس ابتدائی دور میں اقبال کے مخصوص فلسفے کی تلاش تو عبث ہے لیکن بلند نظری، عالی حوصلگی اور احساس ذات کی جھلکیاں ان کے کلام سے انتخاب کر لینی مشکل نہیں۔ ان کی طبیعت کی یہی افتاد تھی جس سے ان کے آئندہ فلسفے نے ایک خاص میلان حاصل کیا:

ہم صفیر و تم مری عالی نگاہی دیکھنا — شاخ نخل طور تا ڑی آشیانے کے لیے

ایک دانے پہ ہے نظر تیری — اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن — دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی

ساتھ ساتھ شاعرانہ واردات کی ہی صورت میں سہی لیکن اس زمانے میں بھی ان کے یہاں ایسے خیالات ملتے ہیں جو آگے چل کر فکری شکل میں ان کے مابعد الطبیعیاتی اور اخلاقی نظام کے عناصر بنے۔

انسان کی اہمیت

اقبال نے گوناگوں طریقوں اور مختلف اسلوبوں سے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انسان قدرت کا شہکار

اور کائنات کی تخلیق کا مقصد ہے:

پریشاں ہوں میں مشت خاک لیکن کچھ نہیں کھلتا — سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں، یا گرد کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا — سراپا نور ہو جس کی حقیقت میں وہ ظلمت ہوں

کائنات کی آرائش و پیرائش اسی کے دم سے ہے۔ کائنات کی تعمیر میں جو خرابیاں مضمر ہیں، جو ناآہنگیاں اور فساد و فتنہ اس میں چھپے ہوئے ہیں ان کو دور کرنا اور ان کی اصلاح کرنا اسی کا منصب ہے۔ "انسان اور بزم قدرت" میں قدرت کی زبان سے اس کے منصب اور ذمہ داریوں کا دوسرے مظاہر سے مقابلہ کیا گیا ہے:

ہے ترے نور سے دا لبتہ مری بود و نبود — باغباں! ہے تری ہستی پہ گلزار وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں — عشق کا تو ہے صحیفہ تری تنویر ہوں میں
میرے بگڑے ہوئے کاموں کو بنایا تو نے — بار جو مجھ سے نہ اٹھا وہ اٹھایا تو نے

انسان کی اس عظمت کا اصل راز اس کا شعور اور آگہی ہے "چاند" سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گرچہ میں ظلمت سراپا ہوں، سراپا نور تو — سینکڑوں منزل ہے ذوق آگہی سے دور تو
جو مری ہستی کا مقصد ہے مجھے معلوم ہے — یہ چمک وہ ہے جبیں جس سے تری محروم ہے

محض شعور ہی نہیں بلکہ شعور ذات اور یا احساس نفس اپنی اہمیت کا پورا پورا وقوف خاص عنصر ہے انسانی فضیلت کا "آفتاب صبح" سے خطاب ہے:

اپنے حسن عالم آرا سے جو تو محرم نہیں — ہمسر یک ذرۂ خاک در آدم نہیں

آرزو

حیات انسانی کی کائناتی اہمیت اس کی آرزوؤں اور تمناؤں میں پوشیدہ ہے۔ آرزو ہی ہے جو اس کو خوب سے خوب تر تک لے جاتی ہے اور فساد میں صلاح کا خواب دکھاتی ہے، ناآہنگیوں میں آہنگ کا خیال آتا ہے۔ مظاہر سے اسباب و علل کی طرف نظریں اٹھتی ہیں:

دوا ہر دکھ کی ہے مجروح تیغ آرزو رہنا — علاج زخم ہے آزاد احسان رفو رہنا

"گل رنگین" سے مخاطب ہیں:

اس چمن میں میں سراپا سوز و ساز آرزو — اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

عمل

اقبال محض آرزوؤں اور تمناؤں میں کھیلتے رہنے کو انسانیت کا جوہر نہیں سمجھتے۔ اصل مقصد ان آرزوؤں اور تمناؤں کو عملی حقیقت بنانا ہے فرزند آدم کا حقیقی امتیاز یہ ہے کہ وہ اسباب و علل کو سمجھے اور خوب سے خوب تر کو پیدا کرے، فساد کی بنیادوں کا پتہ چلائے اور اصلاح کے میدان ہموار کرے، اس کے لیے "زیب محفل ہونا" کافی نہیں "شریک شورش محفل ہونا" ضروری ہے۔ ہنگامۂ عالم کا دور سے تماشا کرنا فضول ہے۔ بلکہ اس کے صدموں کو برداشت کرنا ناگزیر ہے:

تو اگر زحمت کش ہنگامۂ عالم نہیں — یہ فضیلت کا نشاں اے تیر اعظم! نہیں

"سید کی لوح تربت" پڑھتے ہیں کہ "ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں"۔ "تصویر درد" میں اہل وطن کو سبق دیتے ہیں:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے — جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

عمل کے لیے بے خوفی دلیری اور خلوص ضروری ہے، اس کو وہ مومن کی خصوصیت سمجھتے ہیں:

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے — قوت فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

شخصی ارتقاء

سلسلۂ ارتقاء کا یہ آخری حلقہ! انسان جس کی حیاتیاتی قدر و قیمت اسی کی حد تک محدود نہیں بلکہ خود کائنات کی اصلاح و ارتقاء کے لیے بھی اس کے وجود کی اہمیت ہے؛ اقبال کے لیے اسی وقت سے دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔ اس کی شخصی

حیات کا اتنا مختصر وقفہ اور پھر ہمیشہ کے لیے فنا کے بے پایاں اور گہرے سمندر میں ڈوب جانا ان کی فلسفیانہ طبیعت کے لیے کبھی طمانیت بخش نہیں ہوا۔ ان کا تخیل فنا کو زندگی کا منتہا اور غایت تسلیم کرنے کو کبھی آمادہ نہ ہوا۔ وہ زندگی کہتے ہی اس کو ہیں جو فنا سے دوچار نہیں ہوتی "صبح کے ستارے" کی زبانی کہتے ہیں:

زندگی وہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل — کیا وہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

لیکن حیات کا ایک نہایت مختصر مدت کے بعد زوال روزمرہ کا مشاہدہ ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، "کنار راوی" پر کشتی کو دور افق میں غائب ہوتے ہوئے دیکھ کر اقبال کا شاعرانہ تخیل انسانی حیات کی نظروں سے اوجھل ہو جانے کی توجیہہ پیدا کر لیتا ہے:

جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں — ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا — نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

چنانچہ ان کے نزدیک موت زندگی کی فنا نہیں بلکہ وہ خود ایک خاص طرح کی زندگی ہے جس کو عام نظریں محسوس نہیں کر پاتیں:

موت کی ظلمت میں ہے پنہاں شراب زندگی — مر گیا ہوں یوں تو میں لیکن فنا کیوں کر ہوا

۱۹۰۵ء تک کا فکری تجزیہ

یورپ روانہ ہونے سے پہلے تک کی اس مختصر مدت کے کلام کے اس تجزیے سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کی نظر کے سامنے اکثر وہ بنیادی سوال آ چکے تھے جو آخر تک ان کی فکر کا محور رہے۔ ان سوالوں کو جہاں تک حل کرنے کا تعلق ہے اس زمانے کے کلام میں اس کی کوششیں صاف نمایاں ہیں لیکن ان میں فکر کی پختگی سے کہیں زیادہ شاعرانہ تخیل ہے تاہم یہ ضرور ہے کہ ان کی فکر کا رخ گو پوری پوری طرح نہ سہی مگر ایک بڑی حد تک متعین ہو چکا تھا۔

اقبال یورپ کے تعلیمی اور معاشرتی ماحول میں

۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اقبال یورپ روانہ ہو گئے اور ٹرینٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا اور از سر نو کیمبرج یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ پروفیسر آرنلڈ کے علاوہ یہاں انھیں مشہور استاد فلسفہ ڈاکٹر میکٹیگرٹ اور جان سورلے وغیرہ سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر براؤن اور ان کے شاگرد ڈاکٹر نکلسن سے تعلقات نے مشرقیات کے ذوق کو پھر تازہ کر دیا چنانچہ ڈاکٹریٹ کے لیے اقبال نے 'ایرانی مابعد الطبیعیات' کا موضوع منتخب کیا اور جرمنی کی میونک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ اس تقریب سے برلن، میونک اور ہائیڈل برگ کے اساتذۂ فلسفہ سے بھی استفادہ کیا۔ ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی مناسبت سے اسلام کے بنیادی عقائد اور ان کے اثرات، مسلم خصوصاً ایرانی اثرات سے متاثر تصوف اور اس کے اثرات کی تحقیق کا بھی ان کو موقع ملا اور اس موضوع کے خصوصی ماہرین کے مشورے اور رائیں بھی انھیں ملتی رہیں اور بحث و تقد کی سہولتیں بھی میسر آئیں۔ مغربی فلسفہ تو ان کا ہندوستان سے ہی ضمنی مضمون تھا، کیمبرج میں اس پر زیادہ وسیع اور زیادہ عمیق نظر ڈالنے کے مواقع نصیب ہوئے۔

یورپ میں قیام کے دوران حمایت اسلام کا فریضہ انجام دینے والے مشہور اسلامی مصنف جسٹس امیر علی اور بہت سے دوسرے اکابر علم سے روابط پیدا ہوئے۔ مختلف ممالک کی اہم اور نمایاں شخصیتوں سے ملاقات اور گفتگوؤں کے وقتاً فوقتاً اتفاقات رہے۔ متعدد بار اسلامی ممالک کے اکابر اور طلبہ سے بھی بات چیت رہی ہوگی۔ ان روابط اور گفتگوؤں سے انھوں نے بین الاسلامی رشتے اور وطنی تعلق دونوں کے فرقوں کو محسوس کیا ہوگا۔

ہندوستان کی جامد اور کبھی کبھی زندگی کے مقابلے میں انھیں یورپ کی فعالی اور متحرک زندگی کو اندر اور باہر سے دیکھنے کے، سمجھنے کے، اس کے عوامل اور محرکات کو جاننے اور مختلف پہلوؤں سے اس کو جانچنے کے اور اس کے اثرات کی ناپ تول کے پورے مواقع حاصل ہوئے، جن سے ان کی فلسفیانہ طبیعت نے فائدہ اٹھایا۔ مغربی ممالک کے قومی شعور اور بین الاقوامی احساس اور ان کے مظاہر کا اور ان کے بنیادی اسباب و محرکات کا مطالعہ کیا، ان کے تہذیبی اور معاشرتی نتائج اور امکانات پر نظر ڈالی اور مختلف نظری اور عملی فلسفوں سے روشناس ہوئے۔ غرض یہ کہ اقبال نے یورپ میں دیکھا بھی اور دیکھا بھی، سراہا اور اثر لیا۔ ناپسند کیا اور بغاوت کی۔

یورپ کی فعالی کا اقبال پر اثر

یورپ کی قوت عمل اور فعالی کا جہاں تک تعلق ہے اقبال اس سے خاص طور سے متاثر ہوئے

ی کہ ایک زمانے میں اسی تاثر کے پیش نظر انھوں نے شعر و سخن کو بھی ترک کرنے کا ارادہ کر لیا:

مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہدے — جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

لیکن بعض احباب کی فہمائش اور اپنے استاد مسٹر آرنلڈ کے فیصلے کے سامنے انھیں اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔

اقبال ہندوستان میں بھی مادیت پسند اور مظاہر پرست نہ تھے لیکن یورپ کی فعالی میں اس کے مادی زاویہ نظر اور خالص کاروباری نقطۂ نظر کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہ اقبال کی فلسفیانہ افتاد طبع تھی کہ انھوں نے یورپ کی فعالی کو تو گرہ میں باندھا لیکن اس کی مادیت اور مظاہر پسندی سے انھوں نے کوئی رشتہ نہیں جوڑا بلکہ اس کی ہلاکت باری کی پیشگوئی کی:

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا وہ ناپائدار ہوگا

چنانچہ اس زمانے میں اقبال نے مختلف اسلوبوں اور گوناگوں پہلوؤں سے حرکت، عمل، جد و جہد اور زندگی کے لیے تقاضا و پیکار کی ضرورت کی خاص طور سے دعوت دی ہے پہلے عمل کی حیثیت ان کے یہاں خیال و ارادہ سے زیادہ نہ تھی لیکن اب وہ مستقل پیام بن گیا ہے:

بیتاب ہے اس جہاں کی ہر شے — کہتے ہیں جسے سکوں نہیں ہے
جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے — پوشیدہ قرار میں اجل ہے

حرکت اور عمل کے مقابلے میں کوئی عظمت نہیں، گویا یہ وسیلہ نہیں مقصد ہے، محرک نہیں خود زندگی ہے:

آئی لبھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں — کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

حرکت اور عمل کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ شاید کسی وقتی جذبے کے تحت یہ بھی کہنے لگتے ہیں:

جو موج دریا لگی یہ کہنے سفر سے قایم ہے شان میری — گہر یہ بولا صدف نشینی ہے مجھ کو سامان آبرو کا

مگر یہ غالباً شاعرانہ واردات ہے۔

آرزوئے نو اور طلب

ہندوستان میں جو مبہم آرزو تھی اب وہ مستقل طلب کی صورت میں نمایاں ہوگئی ہے گویا آرزو اور طلب لازم اور ملزوم بن گئے ہیں۔ آرزو محض خلش نہیں "آرزوئے نو" ہے "تخلیق مقاصد" کا مقدمہ ہے:

دیکھ مشرب میں ہوا ناقۂ لیلےٰ بیکار — قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

جاگ دوڑ کے لیے مقصد ہے، جد و جہد کا مطلوب ہے، تڑپ کا مدعا ہے:

غرض ہے پیکار زندگی سے، کمال پائے ہلال تیرا — جہاں کا فرض قدیم ہے تو، ادا مثال نماز ہو جا

کوئی شے کسی کی قسمت نہیں۔ مال مسالہ بکھرا پڑا ہے، فراہمی اجارہ داری نہیں، نہ آئینہ سازی سکندر پر موقوف ہے:

نہیں ہے وابستہ زیر گردوں کمال شان سکندری سے — تمام سامان ہے تیرے سینے میں تو بھی آئینہ ساز ہو جا

طلب کو کسی مرحلے پر ختم نہ ہونا چاہیے۔ مطلوب کو ہمیشہ حاصل سے آگے رہنا چاہیے اور کسی بھی حاصل پر اکتفا نہ ہونا چاہیے:

نہ ہو قناعت شعار گلچیں اسی سے قایم ہے شان تیری — وفور گل ہے اگر چمن میں تو اور دامن دراز ہو جا

اس لیے کہ زندگی ہی کا دوسرا نام طلب ہے، طلب نہ ہو تو پھر زندگی زندگی نہیں موت ہے۔

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو — گردش آدمی ہے اور، گردش جام اور ہے

لا موجود الا اللہ

عمل اور جد و جہد کی اہمیت کو فکری طور پر محسوس کر لینے اور اس کو اپنا مستقل پیغام بنا لینے کے ساتھ ساتھ اقبال وحدت وجود کے حامی نظر آتے ہیں اور کثرت کو اصل حقیقت کی ہی جلوہ گری اور اس کا تنزل سمجھتے ہیں۔ سب ایک ہی سرمدی

حقیقت کے تعینات ہیں۔ اگر ان تعینات کے بطن کو محسوس کر لیا جائے تو صرف ایک ہی حقیقت ہے جو موجود ہے باقی سب معدوم۔

رازِ ہستی راز ہے جب تک کوئی محرم نہ ہو — کھل گیا جس دم تو محرم کے سوا کچھ بھی نہیں

لیکن اب وہ اس کثرت کو غالباً محض آگہی کا زائیدہ نہیں خیال کرتے اور نہ اصل ہستی کو پردہ مان کر اس کو اٹھا دینے کی فکر میں رہتے ہیں وہ صرف اتنا چاہتے ہیں کہ اس کثرت کے بطن میں جو وحدت پنہاں ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے اور حسن ازلی کا سب کو مظہر جان کر سب سے عملی دلچسپی لی جائے اور چیزوں میں امتیاز و غیریت کی ناقابل شکست دیواریں نہ حائل کر لی جائیں، زاویۂ نظر کو بدلا سا نہ ہونا چاہیے۔ ایک ہی حقیقت کے یہ سب مختلف مظاہر ہیں اور ہر مظہر اپنا ایک مقام رکھتا ہے:

تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ — چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

ان مظاہر کے عقب میں صرف ایک ہی وجود ہے جو قائم و دائم ہے اور وہی ان مظاہر کا وجود ہے، اس وجود کے علاوہ مظاہر کا کوئی الگ وجود نہیں:

نفیِ ہستی ایک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا — لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا

مظاہر تو اس وجود برتر کے فقط اطوار اور اعتبار ہیں۔ یہ محض بحر وجود کی موجیں ہیں اور حقیقت کی اپنی تڑپیں ہیں:

چشمِ نابینا سے مخفی معنیِ انجام ہے — تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے

مگر وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اصل حقیقت کا عشق اور اس سے تعلق کا شدید احساس ان اطوار وجود اور اعتبارات حقیقت کو باطل کر دیتا ہے تاہم یہ ایک حال ہے؛ یہ عشق کی سرمستی ہے جو اس بتِ اعتبار کو توڑ دیتی ہے:

توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق — ہوش کا دارو ہے گویا مستیِ تسنیم عشق

وحدتِ وجود کا یہ تصور اب محض شاعرانہ نہیں رہا ہے بلکہ ابن عربی کے مستند نظریے سے کچھ زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ تعینات کے واقعی ہونے میں اور باہم امتیازات کے حقیقی ہونے میں ان کا کلام واضح اور قطعی نہیں ہے۔ تاہم اس کی تشریح ابن عربی کے مذاق پر بھی کی جا سکتی ہے[1]

تقاضائے نمود

ظہور کا تقاضا یا نمود کی خواہش جو پہلے صرف ذات حق تک محدود تھی اب پوری کائنات پر چھا گئی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اور عالم کی ہر وحدت ظہور کا تقاضا رکھتی ہے، ہر شے میں نمود کی خواہش ہے۔ دریائے ہستی کا ہر قطرہ ہستی کی لذت سے آشنا ہے:

لذت گیر وجود ہر شے — سرمست مے نمود ہر شے

وجود سے یہ لذت گیری اور نمود کی یہ اندرونی خواہش مابعد الطبیعیاتی بنیاد ہے اقبال کی دعوت حرکت و عمل کی اور خاص عنصر ہے ان کے آئندہ فلسفے کا۔ ظاہر ہے کہ اگر ہستی کی نفی ہی حقیقت ہے، حقیقی کمال فنا ہے اور فطرت کا مطالبہ سکون محض ہے تو پھر حرکت و عمل جو اظہار ہے ہستی کا اور خروش ہے بحر وجود کا، حقیقت سے بغاوت ہے اور مقابلہ ہے فطرت کا۔

تغیر اور نمود

اقبال کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور سے ان کی آئندہ فکر کا جو مسالہ خیالات کی صورت میں برابر جمع ہوتا جا رہا تھا اس میں شاید خالص شاعرانہ توجیہہ کے ضمن میں "تغیر" کا اضافہ اسی زمانے میں ہوا ہے۔

---

[1] خاص طور سے اقبال کا مندرجہ ذیل شعر سے تو یہی واضح ہے کہ وہ تعینات کو فریب نظر ہی سمجھتے تھے لیکن چوں کہ غزل کا شعر ہے اس لیے نظر انداز بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور تاویل بھی کی جا سکتی ہے لیکن اگر ان کا حقیقتاً یہی نقطۂ نظر ہے تو عمل سے اس کا پیوند بہت دشوار ہو گا:

جو ایک تھا اے نگاہ تو نے ہزار کر کے ہمیں دکھایا — یہی اگر کیفیت ہے تیری تو پھر کسے اعتبار ہو گا

"حقیقت ان" ین ن خدا سے شکایت کرتا ہے کہ "جہاں میں کیوں نہ مجھے تو نے لازوال کیا؟" اس شکایت کا جواب دیا گیا ہے کہ:

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی — وہی حسیں ہے حقیقت زوال ہے جس کی

نمود کے لیے یا دوسرے لفظوں میں وجود کے لیے تغیر لازم ہے۔ جو شے حرکت نہیں کر رہی ہے تو اس کی فعلیتوں کا بھی اظہار نہیں ہو رہا ہے اور ایسی حالت میں اس کے ظہور اور نمود کے کوئی معنی نہیں۔ کامل سکون اور مطلق جمود ہستی نہیں محض عقلی تجرید ہے۔ نمود یا وجود برابر بدلتے رہنے یا محض امکانات کے فعلیتوں میں ظاہر ہونے کا نام ہے اس لیے کسی ہستی کے لازوال ہونے کا مفہوم اس کی نیستی یا مکمل خفا ہے۔ مسلسل بدلتے رہنے کا ہی نام شے ہے۔ ایک فعلیت دوسری فعلیت کو جنم دیتی جا رہی ہے اور دوسری تیسری کو، فقط "ثبات تغیر کو ہے زمانے میں"

وطنیت کے بجائے ملّیت

وطن کے خالص جذباتی ماحول سے علیحدگی، مختلف اسلامی ممالک کے باشندوں سے تعلقات اور ان سے یگانگی کا احساس، "ایرانی مابعد الطبیعیات" کی تحقیق کے سلسلے میں مختلف عہدوں اور مختلف وطنوں کی شخصیتوں عمومی وحدت خیال، جذبۂ وطنیت کے مظاہر اور اس کے دور رس نتائج کا شعور، مسلم لیگ کا قیام اور انگلستان میں مقیم ہندوستانیوں کی اس سے دلچسپی اور تحریک وحدت اسلامی ان سب کے ملے جلے اثرات نے غالباً اقبال کو ملت کی انفرادیت اور اس کی غیر منقطع وحدت سے آشنا کیا اور ان کے جذبات میں کھلا انقلاب آگیا۔ ایک "نصب العین" کی صورت میں وطنیت سے ان کا تعلق ختم ہو گیا۔ اب وہ ملت اسلامی کو سماجی وحدت کے ساتھ ساتھ ایک مستقل سیاسی وحدت بھی سمجھنے لگے، اس کی ضرورتوں اور اس کے تقاضوں کو انھوں نے وطنی اور قومی تقاضوں اور ضرورتوں سے جدا محسوس کرنا شروع کر دیا۔

اقبال کے تصورات میں یہ انقلاب نہایت اہم اور دور رس نتائج کا حامل تھا، یہ ایک بڑی موڑ تھی جس نے ان کی زندگی کے رخ کو بدل دیا۔ اگر وہ ملت کی انفرادیت اور وحدت کو مطمح نظر نہ بناتے تو شاید ان کی فکر کوئی مستقل رخ نہ اختیار کرتی اور وہ دنیا کو ایک نیا خیال نہ دے سکتے۔ خود ان کی شاعری بھی وہ اچھوتا انداز نہ حاصل کر پاتی جس نے ان کو شعراء کی صف میں مستقل اور قابل رشک انفرادیت کا حامل بنا دیا اور شاید ان کی شخصیت بھی اتنی پرکشش اور محبوب نہ رہتی نہ ملکی حیثیت میں اور نہ بین الاسلامی بلکہ اب تو بین الاقوامی حیثیت میں بھی

وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا بنانے والا اقبال اب اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مسلم قومیت خود مستقل وحدت ہے جو کسی وطنیت اور کسی قومیت میں محدود نہیں۔ یہ ایک نیا سماجی مظہر ہے جس کے تحفظ کے طریقے بھی نئے ہیں:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

کیوں کہ اس نئے سماجی مظہر کا کوئی اپنا وطن ہی نہیں ہے دنیا تو دنیا اور مذاہب کے برخلاف اس کا نصب العین عقبیٰ بھی نہیں ہے:

کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ — نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

اس انوکھی قومیت کی بنیاد وہ اصول حیات ہیں جن کا شعار اور علامت حرم کی صورت میں پوری قوم کے لیے جاذب ہے:

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا — اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

محدود وطنیت اور ملکی قومیت افتراق کے بت ہیں جن نے ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اپنے دامن کو ان بتوں سے بچا لے جانے کی یہی تدبیر ہے کہ ملی وحدت کے شعار میں جذب ہو جائیں:

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا — بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

• عبدالقادر کے نام پیغام میں اسلامی قومیت کے اصول کو جو اس عوغائے وطنیت میں نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں، ان کا حسن و جمال دکھا کر ملت میں ان کے لیے نئی تڑپ پیدا کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہیں:

جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو — تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں

اور یہ غلط خیال جو ملت کے دل میں جما دیا گیا ہے کہ ملی تصورات مسلمانوں کی ترقی میں حائل ہیں اس کی عملی تردید کا سامان بہم پہنچائیں:

اس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دے کر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں
رختِ جاں بت کدۂ چین سے اٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رخِ سعدیٰ و سلیمیٰ کر دیں

فرد اور ملت

اقبال کے فلسفے میں اگرچہ خودی کے اسرار کا انکشاف مقدم ہے تاہم بے خودی کے رموز کی جھلک ابھی سے نظر آنے لگی ہے۔ جبکہ خودی ایک ان کے دھندلے شخصی میلان سے آگے نہیں بڑھی ہے۔ اس زمانے میں ملت سے ان کا غیر معمولی شغف پھر جرمنی کا فلسفیانہ ماحول، غالباً ان کا ہی اثر تھا کہ اقبال نے فرد کی مستقل وحدت سے صرف نظر کرلی اور فرد پر اسی اسلامی ملت کے جزء کی حیثیت سے نظر ڈالی جس کی انوکھی ساخت وطنیت اور قومیت کے بجائے اصول پر ہے۔

چنانچہ فرد کے انفرادیت سے متمتع ہونے کے معنی ملت کے جزء ہونے کی حیثیت سے ملت کے ضمن میں متمتع ہونے کے ہیں اس کی اپنی الگ کوئی ہستی ہی نہیں، اس کی ہستی تو ملت کے ایک ترکیبی جزء کی ہستی ہے اس لیے اس کا پورا اور صحیح تحقق ملت کی ہستی کے اندر ہی ہو سکتا ہے۔ اس کے اپنے مفاد کے معنی ہی ملت کا اجتماعی مفاد ہے اور بس افراد کی ہستی کو محض ان کی اپنی ہستی کہنا مجاز اور تسامح ہے:

وجودِ افراد کا مجازی ہے ہستیِ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زن مجاز ہو جا

اقبال کی وطن کو واپسی اور افکار کی نشوونما

اقبال جولائی ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے، لندن سے بیرسٹر اور میونک یونیورسٹی، جرمنی سے ڈاکٹر ہو کر ہندوستان واپس آگئے اور اس طرح ان کی رسمی طالب علمی کا دور ختم ہو گیا۔ ان کی فکری نشوونما کا جہاں تک تعلق ہے تو گویا تحصیل علم کے زمانے میں ہی ان کے نظامِ فکر کے بہت سے اجزاء کے نقوش کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ یہ نقوش کچھ تو گہرے تھے اور کچھ اُتھلے اور بعض کی حیثیت رخ اور میلان سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ بعد کے زمانے میں ان میں ترمیم و تنسیخ ہوئی اور اضافہ بھی یہانتک کہ "اسلامی الٰہیات کی تعمیرِ نو" میں ان کی فکر نے ایک منظم اور مربوط فلسفے کی صورت اختیار کرلی۔

(باقی)

رُوح افزا — گرمیوں کا ایک تغذیہ بخش، مزے دار ٹانک، جو ہر عمر کے اشخاص کے لیے مفید اور پسندیدہ ہے۔ اس میں جڑی بوٹیوں، ہری ترکاریوں اور پھولوں کا اکسٹریکٹ اور وٹامن کی صد سترہ اور انناس کا رس شامل ہے

ہمدرد

دہلی ، کانپور ، پٹنہ

رُوح افزا

اقبال کے چار غیر مطبوعہ خطوط

ڈاکٹر محمود الٰہی

حیدر آباد کے دارالترجمہ کو جن اساتذۂ علم و فن کی خدمات حاصل تھیں، ان میں قاضی تلمذ حسین کا نام سرفہرست ہے۔ قاضی صاحب گورکھپور کی خاک سے اٹھے اور پھر وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مشرقی نہج پر ہوئی۔ لیکن انھوں نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس تعلیم سے وہ اُس منزل تک نہیں پہنچ سکتے جس میں ملک و قوم کی فلاح مضمر ہے اس لیے انھوں نے ایم اے او کالج میں داخلہ لیا اور وہاں سے ایم اے کی سند حاصل کی۔

قاضی صاحب نہ تو مغربیت کے دلدادہ تھے اور نہ مشرقیت کے اندھے مقلد۔ وہ دونوں میں اعتدال اور توازن برقرار رکھنا چاہتے تھے اور ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے برقرار رکھا۔ بعض امور میں شبلی کے مخالف ہوتے ہوئے قاضی صاحب سیاسی، مذہبی اور تعلیمی تحریکات میں شبلی کے خوشہ چیں تھے اور غالباً اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں انھیں ایک ممتاز عہدہ قبول کرنا پڑا۔ شبلی کے خطوط میں قاضی صاحب کا ذکر کئی جگہ آیا ہے جس سے ان کے ابتدائی رجحانات اور مصروفیات کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

اردو زبان و ادب کے سلسلے میں قاضی صاحب کے کارناموں کا تنقیدی جائزہ لینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ لسان العصر ریاض رضواں اور مرآۃ المثنوی کا شمار قاضی صاحب کے ادبیات میں ہوگا۔ مثنوی مولانا روم پر ہندوستان میں اب تک جتنا کام ہوا ہے ان میں مرآۃ المثنوی کو ہر لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کو مولانا روم سے جیسا اور جتنا تعلق تھا، اس کا علم اقبالیات کا مطالعہ کرنے والوں کو اچھی طرح ہے۔ مرآۃ المثنوی کی اشاعت کے بعد قاضی صاحب نے علامہ اقبال سے خط و کتابت کی تھی۔ قاضی صاحب کے خطوط کی نقل تو موجود نہیں لیکن علامہ اقبال نے قاضی صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ قاضی صاحب کے ایک عزیز محمد حامد علی صاحب کے پاس محفوظ ہیں۔ میں حامد علی صاحب کا شکر گزار ہوں نہ صرف یہ کہ انھوں نے علامہ اقبال کے یہ خطوط مجھے دیے بلکہ اپنے ذاتی کتب خانے سے استفادہ کرنے کا موقع دیا:

لاہور ۳ر جنوری ۱۹۳۵ء

جناب من تسلیم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ افسوس کہ میں ابھی تک علیل ہوں گو پہلے کی نسبت کسی قدر آواز بہتر ہے۔

مجھے پہلے سے اندیشہ تھا کہ کتاب کی فروخت میں آپ کو زیادہ کامیابی نہیں ہوگی۔ ہندوستان میں فارسی کا مذاق اب بہت کم ہو گیا ہے اس کے علاوہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں عام طور پر مذہبی ذوق بھی معتد بہ ہے۔

بھاول پور کے نوجوان نواب اگرچہ خود فارسی تصانیف کا ذوق شاید نہیں رکھتے تاہم قدر داں ضرور ہیں۔ آپ ان کی خدمت میں ایک کتاب عمدہ جلد کرا کر بطور ہدیہ ارسال کریں، میں بھی کوشش کروں گا کہ ان کی توجہ آپ کی کتاب کی طرف مبذول ہو۔ افسوس کہ ان کے گرد و پیش اچھے آدمی نہیں ہیں لیکن ممکن ہے عنقریب کوئی خوشگوار تبدیلی ان کے مصاحبین میں ہو جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ممکن ہے کہ بہتر نتیجہ ہو۔

اس کے علاوہ آپ سر سید راس مسعود صاحب کو بھوپال لکھیں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال بھی اہل علم کے قدر داں ہیں۔ ان کی خدمت میں کتاب عمدہ جلد کرا کر بھیجیے۔ سید راس مسعود صاحب اور شعیب صاحب قریشی مسٹر بھوپال کی خدمت میں بھی ایک ایک نسخہ ارسال کیجیے۔

والسلام محمد اقبال لاہور

(۲)

جناب من السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ آپ ابھی اپنی کتاب نواب صاحب کی خدمت میں ارسال نہ کیجیے۔ آٹھ دس روز تک حج بیت اللہ کو جانے والے ہیں ان کی واپسی تک انتظار کیجیے جو جلد ہوگی۔ یورپ جانے کا قصد نہیں ہے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۷ر جنوری ۱۹۳۵ء

1 MAY 1963

(۳)

بھوپال ۸ر مارچ ۱۹۳۶ء

جناب قاضی صاحب السلام علیکم

میں ابھی تک علیل ہوں اور یہاں بھوپال میں برقی علاج کے لیے مقیم ہوں۔

اس وقت بھاول پور کی ریاست سندھ مسلم مناقشات میں الجھی ہوئی ہے۔ موقع موزوں نہیں تاہم اگر آپ مرأۃ المثنوی وہاں بھیجنا چاہیں تو عرضداشت کرنل مقبول حسین صاحب قریشی ہوم ممبر ریاست کے نام بھیجیے۔ میں نے ان کے نام ایک خط لکھ دیا ہے جو اسی لفافے میں بند ہے۔ خط بھی عرضداشت کے ہمراہ بھیج دیجیے۔

والسلام

محمد اقبال

(۴)

جناب من

آپ کا لفافہ ابھی ملا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے میری صحت عامہ تو اچھی ہے مگر آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کوئی مقالہ حضرت رومیؒ پر نہیں لکھا۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔

والسلام

محمد اقبال

۲۷ر جولائی ۱۹۳۶ء

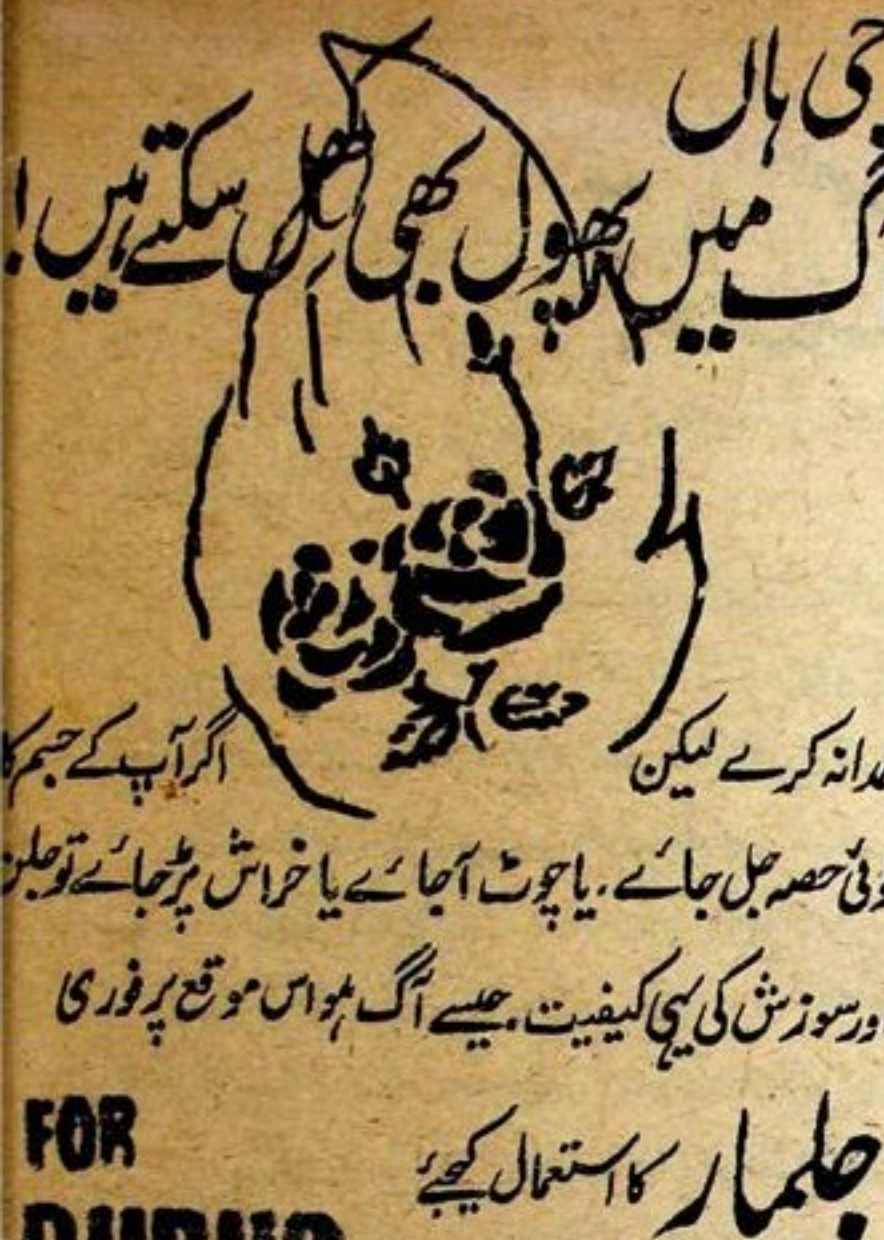

علامہ اقبال بحیثیت استاد

صالحۃ الکبریٰ عرشی

"یوں تو علامہ اقبال کے کلام کی تفسیر و توضیح اور اس کی ترویج و اشاعت کی خاطر ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں مضامین کی بھرمار ہے اور ان موضوعات پر مستقل کتابوں کا بھی روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی کے نشیب و فراز اور ان کی حیات کے شب و روز سے ـــــ جو رنگ و نور سے روشن و تابندہ ہیں۔ لوگ بے پروا ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چند ہی سال ایسے ہیں جن میں وہ ہستیاں ہمارے درمیان موجود ہیں جنھیں علامہ اقبال سے شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ ابھی ایسی آنکھیں باقی ہیں جنھوں نے اس عظیم شاعر کو دیکھا ہے اور ابھی وہ لب و گوش قوت سماعت اور طاقت گویائی رکھتے ہیں جنھوں نے اس محبوب اور محترم شخصیت سے گفت و شنید کا لطف اٹھایا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے تمام بزرگوں سے پرزور درخواست کی جائے کہ وہ علامہ اقبال کی حیات کی ایسی بے شمار کڑیوں کو ملانے میں مدد دیں جو ان کی زنجیر ایام سے غائب ہیں۔ یہ لوگ نہ رہیں گے تو پھر ہمارے سارے ذرایع کمزور اور سارے وسیلے ایک حد تک یقین کی اس بلندی سے نیچے اتر آئیں گے جن پر وہ آج ہیں۔ اس لیے علامہ اقبال پر کام کرنے والے افراد اور ان کے ساتھ ہی ساتھ اداروں پر بھی یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ زیر بحث کام میں عملی دل چسپی لیں۔ یہاں یہ بات بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ شخصیت پر لکھنے والوں کو خصوصیت سے گفتنی اور ناگفتنی کی رسمی اور مذموم قید کو توڑ کر لکھنا چاہیے اور درج گزٹ ہر وہ بات ہونا چاہیے جو اس شخصیت کو یا اس کے کارناموں کو سمجھنے میں کسی نہج سے بھی کارآمد اور مفید ہو سکتی ہو۔ اس موقع پر حضرت یزداں میں چپ نہ رہنے والے بندۂ گستاخ کی مثال جرأت پیدا کرنے میں ضرور مددگار ثابت ہوگی چاہے وہ خود اسی زہر ہلاہل کو قند نہ کہہ سکنے والے سے معلق ہی کیوں نہ ہو۔

ہاں تو ہم سب کو چاہیے کہ ان اصحاب کو اس اہم کام کی طرف متوجہ کیا جائے۔ اگر یہ حضرات لکھنے پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے باقاعدہ ملاقاتیں کی جائیں اور سوالات کے ذریعے وہ سب کچھ معلوم کرنے کی سعی کی جائے جس کے بارے میں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ان کے سینوں میں ایک راز کی صورت ان کے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

اسی جذبے کے تحت ایک بے حد دل چسپ اور بیش قیمت تاثراتی تحریر علامہ اقبال کے ایک شاگرد اور میرے والد (امتیاز علی عرشی صاحب) کے ایک عزیز اور قریبی دوست میاں عطاء الرحمٰن کی پیش کیجاتی ہے جو لاہور کے مشہور صاحب علم و ثروت خانوادے (میاں سر محمد شفیع باغبان پورہ) کے ایک فرد تھے۔ انھوں نے جیسا کہ خود انھوں نے لکھا ہے علامہ اقبال کو اس عالم میں دیکھا جس میں کم لوگوں نے دیکھا ہوگا

میاں صاحب کی یہ تحریر رام پور رضا انٹر کالج کی طرف سے منعقد کیے گئے یوم اقبال کی ایک نشست منعقدہ سنہ ۱۹۴۵ء میں پڑھی گئی تھی جس کی صدارت مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے کی تھی۔ اس جلسے کی دوسری اور تیسری نشست جس میں کلام اقبال سے متعلقہ تفسیری تصاویر کی نمائش بھی شامل تھی رشید احمد صدیقی اور غلام السیدین کے زیر صدارت ہوئی تھیں۔ یہ تصاویر رام پور کے دو مصوروں عظمت اللہ خاں اور اویاما کی کاوشوں کا نتیجہ تھیں۔

میاں صاحب مرحوم کے اس مضمون کی نقل میرے پاس محفوظ تھی جس کے محفوظ رہنے میں علامہ اقبال اور چچا عطاء الرحمٰن۔

دونوں سے عقیدت اور محبت کو دخل رہا ہے۔ امید ہے کہ میاں صاحب کی یہ تحریر ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جائے گی اور علامہ اقبال کی شخصیت کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے کچھ اور پرکشش ہوگی۔

مضمون نگار (میاں عطاء الرحمٰن مرحوم) کے بارے میں بھی یہ عرض کر دوں کہ وہ سالہا سال رام پور میں مقیم رہے اور ریاست کے محکمہ فنانس کے علاوہ بھی بہت سے شعبوں کے منتظم رہے اور آخر میں ہز ہائی نس کے پرائیویٹ سکریٹری بھی۔ وہ بڑے خوش مزاج زندہ دل اور پرخلوص آدمی تھے۔ انھیں ادب سے نہ صرف لگاؤ تھا بلکہ دخل بھی تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ لاہور سے شایع بھی ہوا تھا۔ تقسیم سے پہلے وہ ناسپ لاہور چلے گئے تھے اور وہیں انتقال کیا۔

مضمون اور مضمون نگار کے تعارف کی رسم کے بعد مجھے رخصت کی اجازت دیجیے اور اصل تحریر ملاحظہ فرمائیے ؎

مجھے کالج چھوڑے ہوئے آج تیس برس سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔ گو ایسا اتفاق کبھی کبھار ہوتا ہے۔ لیکن جب بھی مجھے کسی ایسے مجمع میں شمولیت کا موقع ملتا ہے جیسا آج ہے تو شاید گردوِ نواح کی فضا کے اثر سے میرے جسم میں خون ایک نئی طرح سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ اور میں اپنے دماغ میں اس قسم کے محسوسات گردش کرتے ہوئے پاتا ہوں۔ جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ جب آتش جواں تھا۔

علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بے شمار چیزیں شایع ہو چکی ہیں اور ہوتی رہیں گی لیکن ان کے کسی شاگرد نے بحیثیت شاگرد کے اپنے محسوسات بیان نہیں کیے اور مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے مہینوں مسلسل ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان سے انگریزی کی وہ نظمیں پڑھیں جو اس زبان میں اپنی نوع کی بہترین تخلیقات خیال کی جاتی ہیں۔ اور اس مطالعہ میں وہ لطف حاصل کیا ہے جو مشرق کے سب سے بڑے شاعر کی زبان سے مغرب کے سب سے بڑے شعراء کا کلام پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اقبال کی یاد میں غالباً ان موقعوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جب پہلے پہلے میں نے انھیں دیکھا۔ میاں شاہنواز بیرسٹرایٹ لا مرحوم سے ہمیشہ ان کے خاص تعلقات رہے۔ ان دونوں کی آپس میں بے انتہا بے تکلفی تھی اور آخر تک بھی یہ دونوں جب بھی ملتے گفتگو کا وہی پرانا رنگ شروع ہو جاتا۔ میرے چچا میاں سر محمد شفیع مرحوم اور میاں شاہنواز ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے پہلو میں ایک ہی احاطے کی دو کوٹھیوں میں رہتے تھے غالباً سنہ ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء کا ذکر ہے جب میری عمر بھی تیرہ چودہ برس کی تھی۔ چچا سر شفیع کے یہاں میرا آنا جانا اکثر ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہاں میرے دو ہم عمر رفیق رہتے تھے مجھے خواب کی طرح لیکن صاف یاد ہے کہ جس کمرے میں ہم لڑکے بیٹھا کرتے تھے، اس کے برابر والے کمرے میں ان زندہ دل جوانوں کی بے تکلفانہ محفل جما کرتی تھی۔ ہمیں اس میں شمولیت کی اجازت تو ہو ہی نہ سکتی تھی۔ لیکن ہم دروازوں کے روزنوں میں سے اور کسی کھلے دروازے کے باہر دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے اور جہاں اندر سے کسی بزرگ کے نکلنے کی آہٹ ہوتی بھاگ کر چھپ جایا کرتے تھے۔ اقبال ان دنوں محفل کے روح رواں تھے۔ اور ہم نے یہی سمجھتے تھے کہ حد درجہ کے رند مشرب ہیں۔ ان کی آواز سب سے زیادہ بلند ہوتی اور باتوں میں کھلا مذاق جس کے لیے پنجابی زبان خاص طور پر موزوں ہے۔

اسی زمانہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے انجمن کی پرانی شیرانوالہ دروازہ والی عمارت میں ہوا کرتے تھے اور چوں کہ ان جلسوں میں اکثر اوقات دلچسپی کا کافی سامان ہوا کرتا تھا۔ ہم بھی کئی کئی دنوں کا پروگرام ہونے کے باوجود جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا شمولیت سے ناغہ نہیں کرتے تھے خصوصاً ان دنوں میں جب اس وقت کے نوجوان شعرباز، جن میں سے خان احمد حسین خاں اور اقبال خاص طور پر ممتاز تھے، اپنا کلام سنانے والے ہوں مجھے یاد ہے کہ اقبال ایک خوش وضع جوان کی صورت، ہلکی پھلکی سی جینک لگائے، گلے کا بٹن کھلا ہوا شلوار پہنے اسٹیج پر آیا کرتے تھے۔ اور ان کے آتے ہی وہ ہنگامہ جو چندہ جمع کرنے اور خشک و بے لذت تقریر کرنے والوں کی وجہ سے تمام ہال میں برپا رہا کرتا تھا، تالیوں میں تبدیل ہو جاتا اور پھر وہ نغمے فضا میں گونجنے لگتے جن کے سننے کی آرزو میں ہم بھیڑ بھاڑ میں دھکے کھاتے ہوئے داخل ہو کر صبح سے چاروں طرف کے دباؤ کے جھٹکے برداشت کیے ہوئے بیٹھے ہوتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ہماری سمجھ میں آتا تھا یا نہیں کہ شاعر ان نکتہ سنج کیا کہہ رہے ہیں۔ بہرحال اقبال کے دلکش ترنم میں وہ مزا آجاتا تھا جو شاید

کسی محفل رقص و سرود میں بھی نہ آتا۔ اور ان کے اشعار کی داد اس بے تکلف دل سے نکلے ہوئے جوش کے ساتھ دی جاتی جو پنجاب والوں ہی کا حصہ ہے ان جلسوں میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کے بڑے بڑے آدمی شرکت کیا کرتے تھے۔

چنانچہ مولوی نذیر احمد۔ شبلی نعمانی اور حالی جیسی ہستیوں کو پہلے پہلے میں نے یہیں دیکھا یا سنا۔ مولانا حالی بہت ضعیف تھے اور آواز اتنی نہ تھی کہ تمام حاضرین سن سکتے۔ لاؤڈ اسپیکر کا زمانہ نہ تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ مولانا حالی اپنی نظم کے ایک دو اشعار پڑھ کر بیٹھ گئے۔ اور مسودہ اقبال کو دیدیا جو انھوں نے اپنے مخصوص طرز میں سنایا۔ اور نظم پڑھنے سے قبل ایک فی البدیہہ رباعی کہی جس کے قافیہ ردیف نام حالی کلام حالی تھے۔ الفاظ مجھے یاد نہیں۔ اس کے بعد اقبال ولایت چلے گئے اور کئی سال تک سوائے اس کے کہ اقبال کی کوئی نئی غزل مخزن میں نکلی اور ہم نے جھٹ اپنی بیاض میں نقل کر کے اسے یاد کرنا اور گانا شروع کر دیا۔ ان کا سامنا نہ ہو سکا ولایت سے واپس آنے کے بعد ان کے تغزل کے رنگ میں فرق آ گیا اور اس میں کم از کم اس وقت ہمارے لیے وہ رندانہ کیف نہ رہا جو ان کی ولایت سے بھیجی ہوئی اس مشہور غزل کے مقطع میں ہے:

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اسکی
کہیں سر رہ گزار بیٹھا ستم کش انتظار ہوگا

اقبال کے ولایت سے واپس آ جانے کے بعد غالباً ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں جب میں اسکول سے کالج میں پہنچ چکا تھا۔ انجمن حمایت اسلام کا جلسہ ہوا۔ جلسے سے پہلے یہ خبر اڑائی گئی تھی کہ اقبال اپنی کوئی خاص نظم پڑھنے والے ہیں۔ بس پھر کیا تھا وقت سے دو گھنٹے پہلے کالج سے بھاگ لیے اور ابھی چونکہ پنڈال اچھی طرح بھرا نہ تھا، عین ڈائس کے کنارے جس کے اوپر بڑے لوگوں کے لیے کرسیاں بچھی تھیں پاؤں نیچے لٹکا کر جم گئے۔ کالج کے چار یا پانچ نوجوان کہیں تہیہ کر کے بیٹھ جائیں تو انھیں کوئی رعب یا دھمکی دے کر اٹھا نہ لے۔ خصوصاً ایسے پبلک جلسے میں جس میں اقبال نئی نظم پڑھنے والے ہوں۔ دو چار قانون اور حفظ امن کے چوکیدار آئے اور ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا لیکن یہاں "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" والا تہیہ کر کے بیٹھے تھے۔ کسی سے مذاق، کسی پر پھبتیاں، کسی سے کامل خاموشی بلا حرکت کی سیاسی پالیسی برتی گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ جب وقت کم رہ گیا اور جگہ کی قلت پیدا ہوئی تو ایک ہی ہلے میں ڈائس کے چاروں طرف کے کنارے پاؤں لٹکائے ہوئے نوجوانوں سے بھر گئے۔ اور کسی سینے پر کپڑے کا پھول لگا کر اکڑنے والے کی دال نہ گلی۔

غرض یہ کہ اقبال ڈائس پر آئے۔ چاروں طرف سے اللہ اکبر کا ملک شگاف نعرہ بلند ہوا۔ اور حسب معمول ڈائس پر تھوڑی بہت کھسر پھسر کے بعد وہ اپنی نظم پڑھنے کو کھڑے ہوئے۔ باوجود سامعین کے بے حد اصرار کے اقبال نے نظم کو ترنم سے پڑھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ترنم سے پڑھنا نظم کے مضمون سے مناسبت نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ نظم کا عنوان "شکوہ" ہے۔ اقبال پہلا بند پڑھنے لگے:

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہم نوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہزاروں کے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کیا مجال کہ کسی کے سانس لینے کی آواز تک سنائی دے جائے۔ دوسرا بند شروع ہوا:

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم
اے خدا شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

جوں جوں اقبال نظم پڑھتے جاتے تھے سامعین کا جوش بڑھتا جاتا تھا اور ہر بند کے بعد تالیوں اور نعروں کا ایک طوفان برپا ہو جاتا تھا جس کے خاموش ہونے تک اقبال کو بار بار رکنا پڑتا تھا۔ اسی ہنگامہ پرور شان کے ساتھ یہ نظم شروع سے آخر تک پڑھی گئی۔ اور نئے اسلامیہ کالج لاہور کے میدان میں آج تک انجمن حمایت اسلام کے یا دوسرے جتنے بھی جلسے ہوئے ان میں مجھے یاد نہیں کہ کسی میں اس قدر جوش و خروش کا اظہار کیا گیا ہو۔

جس قدر اس قابل یادگار موقع پر ہوا۔

شکوہ کے شایع ہونے کے بعد چاروں طرف سے جوابوں کی بوچھار شروع ہوئی۔ کھلے خطوط میں، اخباری مضامین میں، نثر میں، نظم میں، درجنوں پمفلٹ شایع ہوئے۔ کچھ مولویوں نے اقبال کو برا بھلا کہا۔ لیکن اقبال بالکل خاموش رہے۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد ان کی نظم شمع و شاعر نکلی۔ لیکن یہ قدرے مشکل زبان میں لکھی گئی تھی۔ اور مقصد اور خیالات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ سوائے اعلیٰ تعلیم یافتہ اسلامی پبلک کے اس کا لطف کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ اس لیے گو اس کی شہرت بہت ہوئی لیکن عام نہیں۔

اس سے بھی چند ماہ یا شاید ایک سال بعد جنگ بلقان کے دوران میں خبر ملی کہ اقبال نے خود شکوہ کا جواب لکھا ہے، جو عنقریب کسی جلسے میں پڑھا جائے گا اس پر جوش امید ہر طرف پھیل گیا اور شاید اسی سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مولوی ظفر علی خاں "زمیندار" والوں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ کا اہتمام کیا۔ اور مشتہر ہوا کہ اس میں اقبال کی نظم ہوگی۔ شائقین کا ایک جم غفیر باغ کے پنڈال میں جمع ہوا۔ میں خود اس جلسہ میں موجود تھا۔ اقبال نے نظم اسی طرح ہر طرف سے داد کی بوچھاڑ میں پڑھی۔ ایک ایک شعر نیلام کیا گیا۔ اور ایک گراں قدر رقم بلقان فنڈ کے لیے جمع ہو گئی۔

یہ نظم کئی لحاظ سے شکوہ کی نسبت بہت زیادہ بلند ہے اور اس میں پہلے یہ مسلمانوں کو یہ بتا کر کہ ان کا شعار اسلامی نہیں رہا، وہی سبق دیا گیا ہے جو اقبال کی طرف سے اہل اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہے۔

یعنی یہ کہ زمانہ گزشتہ کی یاد میں رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں، اسلام فنا نہیں ہو سکتا، اگر کوشش کرو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کوشش کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے چند بند سن لیجیے تاکہ اقبال کے درد قومی کے خلوص کا اندازہ ہو سکے۔ اللہ سے شکوہ کے بعد دیکھیے جواب کس طرح شروع ہوتا ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے — پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے رفعت پہ نظر رکھتی ہے — خاک سے اٹھتی ہے گردوں پہ گذر رکھتی ہے
عشق تھا فتنہ گرِ و سرکش و چالاک مرا
آسماں چیر گیا نالۂ بیباک مرا

آئی آواز غم انگیز ہے افسانہ ترا — اشک بیتاب سے لبریز ہے پیمانہ ترا
آسماں گیر ہوا نعرۂ مستانہ ترا — کس قدر شوخ زباں ہے دل دیوانہ ترا
شکر شکوہ کو کیا حسن ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں — راہ دکھلائیں کسے رہرو منزل ہی نہیں
تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں — جس سے تعمیر ہو آدم کی یہ وہ گل ہی نہیں
کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہاں تک تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقبال کے شکوہ کا جواب تھا۔ اب پیغام سنیے:

دیکھ کر رنگ چمن ہو نہ پریشاں مالی — کوکب غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی — گل بر انداز ہے خون شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے

مثل بو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا — رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو، ذرے سے بیاباں ہو جا — نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد سے اجالا کر دے

انجمن کے جلسوں میں بعض اوقات حاضرین اور منتظمین کے درمیان بڑی دل چسپ نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ منتظمین میں عام طور پر اردو کے ان دنوں غالباً سب سے زیادہ مقبول اخبار "پیسہ اخبار" کے ایڈیٹر مولوی محبوب عالم صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالعزیز پیش پیش ہوا کرتے تھے لڑکے خوش طبعی سے انھیں پیسہ اور دھیلا کہا کرتے تھے۔ گو اس سے کسی قسم کی تحقیر مقصود نہ تھی۔ لیکن عبدالعزیز صاحب خصوصاً چونکہ انجمن کے جلسوں میں چندہ جمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کی اور حاضرین کے درمیان خصوصیت تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ جہاں کسی پسندیدہ شاعر کی نظم یا اچھے مقرر کی تقریر کا وقت آیا عبدالعزیز صاحب ڈائس پر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ آپ فلاں صاحب کی نظم سننے کے لیے بے چین ہیں وہ موجود ہیں اور سنانے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن چندے کی رقم مثلاً ساڑھے چار ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے پانچسو اور دلوائیے تو نظم شروع ہو گی۔ ورنہ جب تک پانچ ہزار روپیہ نہ ہوں گے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ اس پر لوگ جلدی جلدی دوڑتے اور رقم پوری کر دی جاتی تو نظم شروع ہوتی۔ اس کا جواب حاضرین کو موقع مل جاتا تھا تو اس طرح دیا جاتا تھا۔ کہ ڈاکٹر اقبال کی اگر کسی جلسے میں کوئی نظم نہیں ہوئی اور حاضرین میں موجود ہیں تو ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور کہا کہ آج تو چندہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں۔ آپ نے ہماری دل چسپی کا کوئی سامان مہیا نہیں کیا۔ لہٰذا علامہ اقبال سے ان کے چند غیر مطبوعہ اشعار سنوا دیجیے۔ اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو چندہ بھی نہیں ہو گا۔ تمام حاضرین تہیہ کر کے بیٹھ جاتے کوئی ایک پیسہ نہیں دیتا۔ چنانچہ منتظمین مجبور ہو جاتے اور علامہ کی منت سماجت کر کے اشعار پڑھواتے۔ ایک ایسا موقع یاد ہے کہ اقبال مسکرا اٹھے اور ایک فی البدیہہ رباعی مذاحیہ شان میں پڑھی، ٹھیک الفاظ مجھے یاد نہیں۔ کچھ اس طرح تھے: پلندہ باقی۔ بہت ہے چندہ باقی۔ اور ابھی تو رہتا ہے بندہ باقی وغیرہ۔ اور یہ سنا کر بیٹھ گئے حاضرین نے پہلے تو خوب تالیاں بجا کر داد دی۔ اس کے بعد ایک صاحب اٹھے اور کہنے لگے کہ اس رباعی کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن شوق پورا نہیں ہوا۔ حسرت رہی جاتی ہے۔ چنانچہ علامہ پھر اٹھے اور پھر چند اشعار سنا کر چندے کی گاڑی کو دوبارہ چلتا کر دیا۔

ٹھیک تاریخیں یاد نہیں لیکن ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کا ذکر ہے۔ جب میں لاہور گورنمنٹ کالج میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ اقبال کئی مرتبہ اس کالج میں پڑھانے پر مامور ہوئے۔ لیکن ہمیشہ فلسفہ کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس مرتبہ شاید پرنسپل کی غیر موجودگی، یا کسی اور وجہ سے ہماری جماعت کو انگریزی نظم کا سبق دینا ان کے فرائض میں شامل ہو گیا اور ہماری بے حد خوش قسمتی تھی کہ ہم نے انگریزی زبان کے بہترین شعرا کی چند بہترین نظمیں ان سے پڑھیں، ان میں جہاں تک مجھے یاد ہے ملٹن کی Penseroso, Allegro اور کیٹس کی Lycidas ڈرامنڈ کی Isabella کی Mac Heck noe اور غالباً کولرج کی Ancient Mariner شامل تھیں Grey's Elegy کے علاوہ شیلے کی Adonais جس کا میں خاص طور سے ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ بلا مبالغہ یہ انگریزی زبان کی چند سب سے بلند نظموں میں سے ایک ہے۔ شیلے کا تخیل ہمارے مشرقی شعراء کی طرح گہرا اور پر معنی ہوتا ہے اور جس طرح ہمارے شعراء ایک ہی شعر میں بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اسی طرح شیلے کے ایک بند میں خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پوری طرح سمجھنے کے لیے قدرے محنت درکار ہوتی ہے۔ اس خاص نظم کے متعلق میں ذرا تفصیل سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اس کے بغیر استاد کی استادانہ حیثیت کی حقیقت کا اظہار نہیں ہو سکے گا۔ آپ کے معلمین تو جانتے ہوں گے۔ لیکن آپ میں سے شاید ہی کوئی طالب علم ایسا ہو جسے معلوم ہو کہ یہ نظم شیلے نے اپنے دلی دوست اور مشہور شاعر (Keats) کے مرثیے کے طور پر لکھی تھی جس کا صرف چوبیس برس کی عمر میں، نقادوں کے نہایت بے رحمی سے اس کی بعض نظموں پر اعتراض کرنے کے صدمے سے انتقال ہو گیا تھا۔ یہ تمام نظم صحیح معنوں میں درد و غم کے اثرات سے معمور ہے اور ہر مصرعے میں ایک زخم خوردہ دل کے خون کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ عجیب بات ہے نظم کے آخری تین چار بندوں میں اس انتہائی مایوسی اور شدت غم کے ذکر کے ساتھ جو کیٹس کی جدائی سے شیلے پر چھا گیا تھا شیلے کی اپنی موت کا جو اس

نظم لکھنے سے تین چار سال بعد واقع ہوئی ہو بہو نظارہ موجود ہے گویا یہ ایک قسم کی پیشگوئی تھی کہ میری موت اس طرح واقع ہونے والی ہے۔ گویا اول تو لکھنے والا شیلے۔ دوسرے اس کی وہ نظم جو انتہائی جذبے کی حالت میں لکھی گئی۔ اور تیسرے پڑھانے والا ڈاکٹر محمد اقبال جو خود گہرے تخیل کا بادشاہ ہے اس مجموعے نے شاگردوں کی جماعت کے ان افراد پر جو حساس دل رکھتے تھے، وہ اثر کیا کہ تمام عمر فراموش نہیں ہو سکتا۔

اس نظم کے پچپن بند ہیں اور ڈاکٹر صاحب پینتالیس منٹ کے ایک کالج کے گھنٹے میں نو، نو مصرعے کا ایک بند ہی روزانہ پڑھاتے تھے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کو پڑھانے میں جماعت کو پڑھنے میں کتنا لطف حاصل ہوتا ہوگا۔ جب شیلے کے خیالات کو علامہ اقبال جیسا آدمی سمجھانے کی غرض سے واضح کرے اور خیال کے ساتھ مقابلہ یا موازنہ کے طور پر اپنے اور اردو شعراء کے خیالات بھی پیش کرے تو سامعین کی خوش قسمتی کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ ایک دریا تھا جو بہتا چلا آتا تھا۔ علامہ کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اور دل یہی چاہتا تھا کہ وہ اسی طرح پڑھاتے جائیں۔ اور ہم طن بھر خاموش بیٹھ کر سنا کریں۔ کالج کا ایک گھنٹہ جو عام طور پر طالب علم کے لیے محنت سے چھٹکارے کی مسرت انگیز خبر لیے ہوئے آتا ہے۔ اس گھنٹے کے ختم ہونے سے دل پر چوٹ کی شکل میں لگتا تھا۔ اور بادل نخواستہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلے جاتے تھے۔

میں چاہتا ہوں کہ شیلے کی (Adonais) سے مثال کے طور پر ایک چیز پیش کر دوں جس سے آپ کو مندرجہ بالا گھنٹوں کی کیفیت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے دوسرے بند کی آخری سطور میں شیلے کہتا ہے کہ ان کی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کی طرح جو دفن شدہ انسان کی بے ثباتی اور نفرت انگیز صورت پر ہنستے ہیں۔ کیٹس نے اپنی آنے والی ہولناک موت کو اپنے آخری نغموں سے اس طرح سجا کر چھپا رکھا تھا کہ وہ نظر نہیں آتی تھی۔

کسی قبر پر اُگے ہوئے پھولوں کو دیکھ کر شیلے کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ایک تو وہ پھول انسان کی بے ثباتی پر ہنستے ہیں۔ دوسرے وہ انسانی لاش کے ڈراؤنے پن کو اپنے حسن سے چھپا دیتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں مرزا غالب فرماتے ہیں:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں　　خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

ان میں قبر کے پھولوں کو دیکھ کر غالب کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوئے کہ یہ پھول ان دل فریب صورتوں کا ایک حصہ ہیں جو اس خاک میں دفن ہیں اور جنھیں ان کے حسن کی طاقت نمونے مٹی کے باہر ظاہر کر دیا ہے۔

علامہ اقبال کا انگریزی تلفظ کچھ اچھا نہ تھا۔ شیلے کو شیلی کہتے تھے۔ اور اردو فارسی بھی حد درجہ پنجابیت لیے ہوئے لہجے میں بولتے تھے۔ یعنی قاف کو کاف ہی کہتے تھے۔ اور حقہ کو حکہ۔ اسی بنا پر مولانا نیاز فتحپوری نے اپنی مشہور ڈائری میں اقبال کی صورت و شکل اور طرز گفتگو کو نہایت غیر شاعرانہ بیان کیا ہے۔ لباس کی طرف توجہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ کالج ہائی کورٹ میں انگریزی سوٹ پہن کر جاتے تھے تو وہ بھی ڈھیلا ڈھالا بغیر استری کے۔ ٹائی ٹیڑھی ہے تو ٹیڑھی ہی سہی۔ عام طور پر بند بھی بندھائی بوچھکا لیا کرتے تھے۔ بوٹ میلے ہیں تو کچھ پروا نہیں۔ بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے۔ پیچھے کو برش کر لیا کرتے تھے۔ پہلے ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ بعد میں بالدار سیاہ ٹوپی اختیار کر لی۔ باوجود اس کے کہ ہماری اس سال کی بی اے کی جماعت جو شروع سینٹرل ماڈل اسکول سے ہی اپنی شرارت پسندی کے لیے مشہور چلی آتی تھی۔ اور خصوصاً بُرے تلفظ والے پروفیسر کا تو ناک میں دم کر دیا کرتی تھی، ان کے گھنٹے میں اس قدر خاموش ہو کر بیٹھ جاتی تھی کہ ایک تنکا بھی زمین پر گرے اور اس کی آواز سنائی دے جائے۔ مجھے یاد نہیں کہ اقبال نے کبھی کسی لڑکے کو کسی قصور پر سزا دی ہو۔ بلکہ دھمکی تک بھی کبھی نہیں دی۔ حیرت کی بات ہے کہ مجھے اب علم ہوا ہے کہ ان کی داہنی آنکھ بیکار تھی۔ جماعت میں ہمیشہ ان سے قریب بیٹھتا تھا لیکن میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ میں نے علامہ اقبال کو سگریٹ یا سگار پیتے کبھی نہیں دیکھا۔ گو سنا ہے کہ حقہ کے بہت شوقین تھے۔ کالج میں تو بغل میں ایک آدھ کتاب یا کلاس کا رجسٹر لیے۔ سر جھکائے کبھی کچھ گنگناتے ہوئے ادھر ادھر دکھائی دیتے تھے۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے تھے۔

ان دنوں کالج میں ایک سوسائٹی بزم سخن کے نام سے تھی، جس کے جلسے عام طور پر پندرھویں دن یا مہینے میں ایک بار ہوا کرتے تھے۔ لیکن زندہ دل پروفیسر شیخ نور الٰہی صاحب اس کے مستقل صدر تھے۔ ہر جلسہ میں اپنے کالج کے علاوہ دوسرے کالجوں کے اتنے طالب علم جمع ہو جایا کرتے تھے جتنے کمرے میں سما سکتے۔ اس بزم میں کالج کے لڑکے اپنا منظوم کلام جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہوتا سنایا کرتے تھے۔ بعض اوقات طرح مقرر کر دی

جاتی تھی جس پر سب مشق سخن کرتے تھے۔ اور چوں کہ ہمارے صدر میں پہلے عرض کر چکا ہوں، زندہ دل تھے، وہ مبتذل قسم کی عریانی کے سوا ہر قسم کی بات کہہ لینے دیا کرتے تھے۔ آج کل کی طرح اس وقت شعراء میں اتنی عریاں پسندی بھی نہ تھی لیکن مذاق اور پھبتیوں میں کالج کے کسی نہ کسی رنگ میں ممتاز طالب علموں اور پروفیسروں تک کو شعر میں باندھ لیا جاتا تھا جس سے جلسہ کی دلچسپی دوبالا ہو جاتی تھی۔ خدا جانے اب تک وہ بزم قایم ہے یا نہیں۔ بہرحال اس وقت بہت کوشش کی گئی لیکن صدر بننا تو درکنار علامہ اقبال کبھی اس کے ایک جلسہ میں بھی شریک نہیں ہوئے۔ البتہ (COLLEGE DAY) کے موقع پر ہر سال کسی بھلے آدمی نے بہترین اردو نظم کے لیے ایک مستقل انعام مقرر کر رکھا تھا۔ اس مقابلے میں جو لڑکے نظمیں بھیجتے تھے ان کے جج علامہ اقبال ہی ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب، وہ کالج میں پڑھاتے بھی نہ تھے، تو یہ نظمیں فیصلے کے لیے انھیں کے پاس بھیجی جایا کرتی تھیں۔ بعد میں وہ نظمیں جو اول، دوم، اور سوم درجہ پر رہتیں کالج ڈے پر تمام لڑکوں کے سامنے ان کے مصنف پڑھ کر سناتے اور انعام حاصل کرتے تھے۔ ویسے عام طور پر بھی علامہ اقبال، نوجوانوں کے شعر کہنے کے خلاف تھے مجھے یاد ہے کہ ان کی پروفیسری کے دنوں میں جب وہ ہمیں پڑھاتے تھے ہم ان کی کلاس کے دو تین لڑکے اپنی اپنی غزلیں لے کر ایک دن اکٹھے ان کے پاس گئے اور عرض کیا کہ ہم آپ کے شاگرد ہیں اور شعر کہنے کا شوق رکھتے ہیں اگر کبھی کبھی آپ ہماری ناچیز کوشش دیکھ کر تھوڑی بہت اصلاح فرما دیا کریں تو بڑی عنایت ہوگی۔ فرمایا کہ بھائی میں کبھی کسی کے اشعار پر اصلاح نہیں دیا کرتا۔ جو تمہارے دماغ میں آئے لکھو۔ لیکن اگر میری نصیحت مانو تو شعر کہنا چھوڑ دو یہ مشغلہ اچھا نہیں۔

اقبال کے ملنے والے عام طور پر کہتے ہیں کہ اپنے گھر میں بہ فراغت بیٹھے ہوئے بھی جب کبھی بات چیت کے دوران اچھے اشعار پڑھے جاتے تو ان کے آنسو نکل آتے تھے۔ اور یہ تو مشہور ہے کہ شعر کہتے وقت اکثر زار و قطار رویا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہ ان سے عند الطلب شعر نہیں کہلوائے جا سکتے تھے، جب تک ان پر وہ خاص کیفیت طاری نہ ہو اور طاری ہو تو بیسوں اشعار ایک وقت میں کہہ جاتے تھے۔ اس سے مجھے ایک واقعہ یاد آگیا ہے، حالانکہ وہ پڑھاتے وقت کتاب کے مصنفوں ہی سے سروکار رکھتے تھے۔ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ سبق چھوڑ کر گویا جماعت سے باتیں کرنے لگے۔ جو نظم وہ پڑھا رہے تھے اس میں ایک مصرعے کے یہ معنی تھے کہ شاعر کے لیے زبان کے الفاظ اظہار خیالات کو کافی نہیں ہوتے۔ اقبال کتاب کی طرف سے نگاہ اٹھا کر جماعت سے مخاطب ہو گئے اور فرمایا کہ آپ لوگ اندازہ نہیں کر سکتے کہ شاعر کے دماغ میں جس وقت آمد ہوتی ہے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ خیالات ایک طوفان کی طرح امڈے چلے آتے ہیں، اس کو ہر خیال کے لیے پہلے الفاظ تلاش کرنا پڑتے ہیں پھر عروض اور قافیہ ردیف کے مرحلوں کو طے کرنا پڑتا ہے اس کے بعد ایک شعر بنتا ہے۔ اس وقت تک درجنوں ایسے خیالات بھول کر ضایع ہو جاتے ہیں جو اگر شعر میں آجاتے تو اس مخصوص شعر سے شاید کہیں بہتر ہوتے۔ شاعر بعض اوقات سخت بے چین ہوتا ہے اور تڑپتا ہے کہ اظہار خیال کے لیے ایسے الفاظ نہیں ملتے یا ملتے ہیں تو اس خاص بحر یا قافیہ یا ردیف میں ادا نہیں ہو سکتے جس میں نظم یا غزل لکھی جا رہی ہے۔

(اقبال ریویو سہ ماہی)

پہلی فخریہ پیش کش

ماہنامہ آجکل کراچی

کا عظیم الشان افسانہ نمبر فوٹو آفسٹ پر

جس میں

ہندو پاک کے تمام مشہور افسانہ نگار حصہ لے رہے ہیں

قیمت: دو روپے ۔ صفحات ۲۷۵

یہ عظیم الشان افسانہ نمبر جو ۱۴ اگست ۱۹۶۳ء کو منظر عام پر آرہا ہے۔ سالانہ خریداروں کی خدمت میں مفت پیش کیا جائے گا۔ اگر آپ سالانہ خریدار نہیں ہیں تو آج ہی سالانہ قیمت چھ روپے اور افسانہ نمبر رجسٹری خرچ تریسٹھ پیسے (کل 6/63) ارسال فرما کر یہ نمبر آپ بھی مفت حاصل کریں۔

ترسیل زر کے پتے:

پاکستان میں: دفتر آجکل ۱۱۱ رائٹرز چیمبر۔ بندر روڈ۔ کراچی

ہندوستان میں: ایم برکت اللہ عادل ۱۲۰ چک مانز اروڈ کراس بنگلور ۱

اکبر اور اقبال

نور محمد ایم، اے

کمال اور زوال، بلندی اور پستی، سرفرازی اور تنزلی، ان الفاظ میں دنیا کی تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ ہندوستان مغلوں کے زمانے میں اپنے عروج کا شباب دیکھ چکا تھا، شاہجہاں کے عہد میں پردیسیوں کی نظرِ بد اس شباب کو گھن بن کر لگ گئی اور بسرعت تمام شیب میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ آخر ۵۷ء کا حادثہ رونما ہوا ۵۷ء میں سلطنت مغلیہ نے ایک سنبھالا لینے کے بعد ہمیشہ کے لیے دم توڑ دیا اور وہ بابری شمع جو اس بزم رنگیں کو تین سو سال تک جلا دیتی رہی جھلملا کے ختم ہو گئی اور اپنے ساتھ پرانے ہندوستان کو بھی ختم کر گئی ۵۷ء کے بعد ہندوستان نے ایک نیا جنم لیا۔ غالب نے واقعہ ۵۷ء کو "رستخیز بیجا" کے نام سے یاد کیا ہے لیکن میرے نزدیک یہ "رستخیز بجا" تھا۔ ۵۷ء نے جدید ہندوستان کی بنیاد رکھی، وہ ہندوستان جو اورنگ زیب کی وفات کے وقت سسکیاں لے رہا تھا کب تک زندہ رہتا۔

قوموں کی زندگی کو ہم تین شعبوں میں تقسیم کر سکتے ہیں مذہبی، ادبی، سیاسی۔ تنزل پذیر قوم ان تینوں چیزوں سے محروم ہو جاتی ہے اس کے ایمان میں تزلزل، اس کے ادب میں انحطاط اور اس کی سیاست میں گتھیاں اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کوئی ایسا مذہبی سرگروہ نہیں ملتا جو صحیح معنوں میں اس کی رہنمائی کرے اور نہ کوئی ایسا سیاست داں ملتا ہے جو قوم کے سامنے ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرے قوموں کا زوال ایک یا دو دن کی بات نہیں ہوتی، سال یا دو سال کا واقعہ نہیں ہوتا قوم کو بنتے اور بگڑتے صدیاں لگ جاتی ہیں۔

۵۷ء کا واقعہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا منحوس ترین سانحہ ہے یہ ایک ایسا جانگداز اور روح فرسا صدمہ تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھے، مذہب سے جو مسلمانوں کا اوڑھنا اور بچھونا ہے روگردانی شروع ہوئے عرصہ ہو چکا تھا لیکن اس غیر متوقع آفت نے رہے سہے عقائد اور اعتقادات بھی ڈھیل کر دیے اور اس طرح ایمان میں تزلزل کی بنیاد پڑی۔

بھولا ہوا خواب جب حقیقت کا روپ دھارن نہ کر سکا تو مسلمانوں کے حواس مختل ہو کر رہ گئے وہ سمجھتے تھے کہ دہلی کی سلطنت ان کی میراث ہے اور اس کی بقا اور حفاظت ان کی سیاست۔ جب یہ ہاتھ سے نکل گئی تو ان کی سیاست کا خاتمہ ہو گیا انھیں اب کوئی شاہراہ عمل سجھائی نہیں دیتی تھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انھیں ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ ان کی بدحواسی، بیچینی اور اضطراب نے انھیں اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ کاوش فکر کرتے اور اس غیر متوقع مصیبت کا کوئی ٹھیک حل ڈھونڈ نکالتے۔ یہ تھے وہ حالات جہاں سے سیاست میں پیچیدگیاں اور غلط فہمیاں شروع ہوتی ہیں۔

"کل کی نوخیز چھوکری" سلطنت کا سایہ عاطفت اٹھ جانے کے بعد مبہوت ہو کر رہ گئی۔ یتیمی کے صدمے نے اس سے بھلے اور برے میں امتیاز کرنے کی قوت صلب کر لی اور وہ اپنے خیر خواہوں میں تمیز نہ کر سکی۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی شاہی حرم اور دربار میں پرورش پائی ہوئی بیگموں اور شاہوں کے منہ لگی ہوئی کیا جانتی کہ مصیبت کیا چیز ہوتی ہے، جس وقت قلعہ سے نکالی گئی نادان تھی، عوام کے نرغہ میں جا پھنسی، جوانی کے دن تھے اور امنگوں کی راتیں، ان سے کھل کھیلی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف عزت ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو دوسری طرف اثاثہ لٹتا دکھائی دیا، غرضکہ اس طرح ادب میں انحطاط رونما ہوا

ایمان میں تزلزل سیاست میں پیچیدگیاں اور ادب میں انحطاط ان تینوں نے مل کر مسلم قوم کے لیے نہ صرف زوال کے سامان مہیا کر دیئے بلکہ اسے اس مقام تک لے آئے جہاں اس کی بقا کے لیے کسی مرد کامل کی ضرورت لاحق ہوئی۔ توحید کی امانت سینوں میں رکھنے

والے اب نہ صرف ایک مذہبی رہنما کے محتاج تھے بلکہ انھیں اپنی بقا کے لیے ایک مجتہد ادیب کی ضرورت تھی اور سیاست میں ایک دور اندیش اور تجربہ کار سیاستداں کی۔ ان کی کشتیٔ حیات باد حوادث کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر پاش پاش ہوئی جا رہی تھی۔ ٹھیک اسی وقت چند افراد خدا کا نام لے کر قوم کو بچانے کا عزم کر کے اٹھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قوم کی اصلاح ایک شخص کے بوتے کا کام نہ تھا، مولوی ابوالقاسم مذہبی اصلاح کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور دیوبند میں ایک مذہبی جامع کی بنیاد رکھتے ہیں، سرسید سیاسی رہنما کا کام اپنے ذمے لیتے ہیں لیکن اس گُر سے بخوبی واقف ہیں کہ سیاست کی پہلی سیڑھی تعلیم ہے اسی لیے وہ علوم جدید و قدیم کی تعلیم مسلمانوں میں عام کرنے کی غرض سے علی گڑھ میں ایک مرکزی دارالعلوم کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور ادب کی اصلاح اور صحیح نہج پر لانے کا سہرا حالی کے سر رہتا ہے۔

حالی اردو ادب میں پہلی ہستی ہے جس کے یہاں اجتماعی شعور پایا جاتا ہے۔ حالی کو اپنے سے زیادہ قوم اور وطن کا خیال ہے وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے دلی سے حد درجہ متاثر ہیں ان کی زندگی کا ہر لمحہ اس بے حسی اور بے دلی کو دور کرنے کے لیے وقف تھا انھوں نے ادب کو پہلی مرتبہ ایک وسیلہ اور ذریعہ کے طور پر استعمال کیا حالی کے یہاں ادب مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ یہ محض ان کے اظہار خیال کا ذریعہ ہے۔ حالی کے نزدیک مقصد اتنا اہم ہے کہ وہ نظم و نثر دونوں کو اسی مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں حتیٰ کہ غزل کی سی صنف ادب کو بھی وہ وسیلہ کے طور پر ہی کام میں لاتے ہیں "حالی رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" حالی نے ماضی کے گن گائے اور حال کی بدحالی پر نیر بہائے، حالی مغرب سے مرعوب تھے وہاں کی مادی ترقیات اور علوم و فنون کے عروج نے ان کی نظر میں خیرگی پیدا کر دی تھی، حالی کی یہ کیفیت بہت کچھ سرسید کی صحبت اور قربت کا نتیجہ تھی حالی کے کردار میں یہ ایک عجیب خصوصیت تھی کہ وہ شخصیتوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے، حالی نے سرسید سے متاثر ہو کر عمر بھر "پیروی مغربی" کے راگ الاپے حالی نے ایک پختہ کار اور ہوشیار فن کار کی طرح ہمارے سامنے دو متضاد تصویریں پیش کر دیں۔ ماضی کی رونق اور حالی کی خستگی اس درماندگی اور خستہ حالی کا علاج حالی نے "پیروی مغربی" تجویز کیا۔

لیکن حالی ہی کے زمانے میں ایک شخص نے یہ آواز بلند کی کہ ہماری موجودہ پستی، افلاس اور ادبار کی وجہ ہماری مغرب کی اندھی اور کورانہ تقلید ہے ہم نے جادۂ حق کو چھوڑ دیا اس لیے ہم قعر مذلت میں گر پڑے۔ یہ آواز اکبر کی تھی۔ اکبر نے مسلمانوں کی بہبودی اور خوشنودی اسی میں دیکھی کہ وہ سختی کے ساتھ اپنے ماضی سے وابستہ رہیں۔ حالی مسلمانوں کے ماضی کو روشن اور شاندار تسلیم کرتے ہوئے بھی جب کشمکش اور انجمن کے دوراہے پر پہنچتے ہیں تو مسلمانوں کو "آتش نمرود" میں "بے خطر" کود پڑنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اکبر اس اندھی تقلید کے قایل نہیں قدامت پسندی ان کا مذہب اور شرقیت ان کا ایمان ہے "غیرت قومی" اکبر کے مزاج کا جزو لاینفک ہے خواہ وہ تعلیم ہو یا سیاست ہو یا مذہب ہو یا معاشرت اکبر کبھی غیرت قومی کا دامن نہیں چھوڑتے۔

اکبر کے بعد جس شخص نے مغربی تہذیب کی یلغار کو روکنے کی کوشش کی وہ اقبال تھے۔ اکبر نے قریب قریب ان ہی چیزوں کی مخالفت کی تھی جن چیزوں کی اقبال نے کی یعنی مغرب کی اندھی تقلید، عورتوں کی آزادی اور ان کی موجودہ تعلیم مشنیوں کا غلبہ، مغربی تعلیم، قرآن اور مذہب سے بے نیازی وغیرہ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اکبر کے منہ سے جب ہم ان باتوں کی مخالفت سنتے ہیں تو ہم انھیں محض تفریح کی چیز سمجھ کر ٹال جاتے ہیں لیکن جب اقبال کے منہ سے سنتے ہیں تو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں —— اس سے پہلے کہ میں یہ واضح کرنے کی کوشش کروں کہ کیوں اقبال کی آواز کوہ ندا کی آواز کا اثر رکھتی ہے کہ ہم بے اختیارانہ اس کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کیوں اکبر کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی یہ مناسب ہوگا کہ میں ایک ہی موضوع پر اکبر کے اور پھر اقبال کے اشعار آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کر دوں اشعار کی تعداد صبر آزما ہے لیکن میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ناگزیر سا امر ہے۔ اکبر مغرب کی اندھی تقلید کے بارے میں کہتے ہیں!

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے — بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی — یورپ کا تری رگوں میں خون بھی ہے

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

خدا جانے کہا کس نے یہ کسی دن عقل سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا
مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا
وہ چھینٹے دیجیے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بچ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا
چلے مقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں
دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گور نر جھک جائیں
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں کو کھولی
ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں
مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ ہیں یہ نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد
عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح
ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ
یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ
مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں
میرے اسلام کو ایک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

اقبال کہتے ہیں:

ہاتھ بے زور ہیں الحاد سے جی خوگر ہیں
امتی باعثِ رسوائی پیغمبر ہیں
بت شکن اٹھ گئے باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر، اور پسر آذر ہیں
بادہ آشام نئے بادہ نیا خم بھی نئے
حرم کعبہ نیا بت بھی نئے تم بھی نئے

ہر کوئی مست مئے ذوق تن آسانی ہے
تم مسلمان ہو؟ یہ انداز مسلمانی ہے
حیدری فقر ہے نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

1 MAY 1963

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے بارے میں اکبر کی ظرافت کی پھلجھڑیاں ملاحظہ ہوں:

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے
خدمت میں ہے دلیری اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہوگئی بالآخر
شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب ان کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ان اشعار سے آپ یہ غلط نتیجہ نہ نکال لیں کہ اکبر تعلیم نسواں کے مخالف تھے، یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی وہ عورتوں میں تعلیم کا رواج دیکھنا چاہتے تھے لیکن کس قسم کا یہ ملاحظہ ہو:

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر
خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں
ایک ہی بات فقط کہتا ہے یاں حکمت کو
دُو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم
قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

اس سلسلے میں اکبر کی ایک طویل نظم "تعلیم نسواں" ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے دیکھنے کی چیز ہے۔ اقبال "آزادی نسواں" کے عنوان سے کہتے ہیں:

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خرد مند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیٔ نسواں کہ زمرد کا گلو بند

اسی سلسلے میں اقبال کے اور اشعار پیش ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازاں
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپ و غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

تعلیم کے بارے میں اکبر کہتے ہیں:

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لیے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

نظر ان کی رہی کالج ہی میں علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

طفل دل محوِ طلسم رنگ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آئی اور مذہب کو فالج ہو گیا

کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب
دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کیا تھ

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف
نیچر کی جو طاقتوں کو کر دیں مکشوف

لیکن تم سے امید کیسا ہو کہ تمہیں
عہدہ مطلوب ہے وطن مالوف

اقبال کہتے ہیں:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

تجھے کتاب سے حاصل نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

پختہ اذکار کہاں ڈھونڈھنے جائے کوئی
اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام

مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر
چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

پر ہے اذکار سے ان مدرسے والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز

اور یہ اہل کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ

نئی تہذیب کے متعلق اکبر کہتے ہیں:

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی
کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشوں کی

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں
حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں

ناز تھا ان کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر
اگزیبشن میں مرے اک دوست عریاں ہو گئے

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق
ان حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا
ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا

حسن و جنون بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطف بحر ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا
اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر
تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار

حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا
شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

آخر کو رہو گے نہ ادھر کے نہ ادھر کے
انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

اقبال کہتے ہیں:

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب — کہ روح اس میں مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید — ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

حرارت ہے بلا کی بادۂ تہذیب حاضر میں — بھڑک اٹھا بھبوکا بن کے مسلم کا تن خاکی
نئے انداز پائے نوجوانوں کی طبیعت نے — یہ رعنائی یہ بیداری یہ آزادی یہ بینائی
تغیر آگیا ایسا تدبر میں تخیل میں — ہنسی سمجھی گئی گلشن میں غنچوں کی جگر چاکی
کون ہے تارک آئینِ رسولِ مختار — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار — ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغام محبت کا تمہیں پاس نہیں

اقبال نے جب یورپی تہذیب اور تمدن کا بہ نظر غور مطالعہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے:

دیار مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی — جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

لیکن یہ سن کر آپ کو تعجب ہوگا کہ اکبر نے سات سمندر دور ہوتے ہوئے بھی اقبال سے پیشتر یہ کہدیا تھا۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو — بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائیگی بھاپ — دیکھنا اکبر بچائے رہنا آپنے آپ کو

نفس انسانی پر مشینوں کے غلبہ کے بارے میں اکبر اور اقبال دونوں نے اپنے اپنے مخصوص رنگ میں اظہار خیال کیا ہے۔

اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے — اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے (اکبر)
ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت — احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبال)

قرآن کریم مسلمانوں کے لیے آئین حیات کا کام دیتا ہے مسلمانوں نے اگر دنیا میں شہرت و نیک نامی حاصل کی عظمت و بزرگی پائی ترقی و سرداری کے مدارج طے کیے تو یہ سب اسی آئین حیات پر عمل پیرا ہونے کا صدقہ تھا۔ اکبر و اقبال دونوں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ع

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اکبر کہتے ہیں:

صوم ہے ایمان سے، ایمان رخصت صوم گم — قوم ہے قرآن سے قرآن رخصت قوم گم

اور اقبال کہتے ہیں:

از یک آئین مسلمان زندہ است — پیکر ملت ز قرآن زندہ است

اشعار کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے اس کا مجھے احساس ہے لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں میرے مقصد کی وضاحت کے لیے یہ ایک ضروری امر تھا آپ نے ان اشعار سے اندازہ لگایا ہوگا کہ اساسی چیزوں کے متعلق اکبر اور اقبال دونوں ہم خیال ہیں لیکن اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اکبر کے مقابلے میں اقبال کیوں زیادہ کامیاب رہے اس کے کئی اسباب ہیں۔

آرٹ کی عظمت بہت کچھ آرٹسٹ کی شخصیت اور اس کے عقائد پر منحصر ہے۔ اکبر اور اقبال کی شخصیت میں بعد المشرقین ہے۔ ایک دیو پیکر ہے تو دوسرا بونا، ایک علوم جدید و قدیم کا ماہر تو دوسرا صرف علوم قدیم سے آشنا، ایک مشرق و مغرب کے بہترین افکار سے مزین تو دوسرا گنے چنے لوگوں کے خیالات سے آگاہ، ایک فلسفی تو دوسرا صوفی بعد میں اور ظریف پہلے، اقبال کے کلام میں تاثیر ان کے شاعرانہ

اعجاز سے نہیں ہے کیوں کہ جہاں تک فنی خصوصیات کا تعلق ہے اکبر کا کلام کسی لحاظ سے، کسی پہلو سے اقبال کے کلام سے کم نہیں ہے بلکہ میرا تو خیال ہے کہ جو قدرت اکبر کو زبان پر حاصل تھی وہ شاید اقبال کو کبھی نصیب نہ ہوئی اس فرق کی وجہ جیسا کہ میں ابھی کہہ چکا ہوں شاعرانہ اعجاز نہیں بلکہ شخصیتوں کا فرق ہے۔ اکبر کی شخصیت نہ اتنی بلند ہے جتنی اقبال کی ہے نہ اس میں وہ ہمہ گیری ہے جو اقبال کے یہاں ہے۔ زبان پر اگر قدرت ہے تو شعر میں شگفتگی، برجستگی، سلاست، طلاقت اور روانی پیدا ہو سکتی ہے۔ شعر میں حسن بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب تک محرکاتِ شعری عظیم نہ ہوں آرٹ میں بلندی نہیں آسکتی۔ اکبر کے یہاں تخریبی پہلو نمایاں ہے اقبال کے یہاں تعمیری پہلو پیش پیش ہے۔

اکبر کے یہاں سوجھ تھی اور بلا کی سوجھ میں بوجھ کو بہت کم دخل تھا، اکبر ہر چیز کے مضحک پہلو کو پہلی نظر میں دیکھ لیتے ہیں اور اسی کو اساسی پہلو قرار دے کر طنز و ظرافت کے تیروں کی بوچھار شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر زیادہ تر چیزوں کا سرسری مطالعہ کرتے ہیں، اقبال نے ان چیزوں کا مطالعہ ساحل پر کھڑے ہو کر محفوظ و مثبت مقام سے نہیں کیا بلکہ انھوں نے طوفان سے چشمک زنی کی، وہ موجوں سے کھیلے اور چٹانوں سے ٹکرائے، اسی چشمک، کھیل اور ٹکر سے وہ شرارہ وجود میں آیا جس نے ان کے کلام کو زیادہ موثر، زیادہ بلند اور رفیع بنا دیا برخلاف اس کے اکبر ان چیزوں کو غول بیابانی سمجھتے رہے۔ انھوں نے ایک محفوظ اور مثبت مقام سے طوفان کا صرف نظارہ کیا اسی لیے وہ اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے ان کا مطالعہ کچا، خام اور ناقص رہا، اسی لیے وہ جزئیات پیش کرنے سے قاصر رہے وہ برائیوں پر زور دیتے ہیں جو پہلی نظر میں دکھائی دے جاتی ہیں، اکبر بات کو بتنگڑ بنا کر پیش کرتے ہیں اور معمولی چیز پر زور دینے میں ان کا وار ہمیشہ کوٹ، پتلون، اور سایہ پر ہی پڑتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ اکبر اوچھے ہتھیاروں سے وار کرتے ہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا اقبال ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پر بھی نظر رکھتے ہیں اور چیزوں کے حسن قبح کا انحصار ان کی ظاہری سج دھج پر نہیں بلکہ ان کی تمام خصوصیات پر رکھتے ہیں ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی ناکامی کا سبب ان کے مطالعے کی سطحیت اور فکر روشن کی کمی ہے۔ لیکن صرف اسی چیز کو اکبر کی ناکامیابی کی وجہ قرار دینا اکبر کے ساتھ ناانصافی ہوگی اکبر کے زمانے میں مغربی سیلاب نیا نیا تھا نئے سیلاب میں شدت ہوتی ہے، طاقت ہوتی ہے، زور ہوتا ہے، اچھے اچھوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی حال اس وقت بھی ہوا سلطنت کے نقصان اور تعلیم کے فقدان نے یہ امر ذہن نشین کر دیا تھا کہ ہماری نجات اسی میں ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں مغرب کی پیروی شروع کر دیں مغربی معاشرت اور تمدن کا غائر نظر سے مطالعہ کسی نے نہیں کیا غلام قوم کے قوائے ذہنی مفلوج ہو جاتے ہیں وہ اچھے اور برے میں تمیز نہیں کر سکتی خوب و زشت میں امتیاز نہیں کر سکتی اقبال کے الفاظ میں:

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر — کہ دنیا میں فقط مردانِ حر کی آنکھ ہے بینا

فاتح کا ہر عیب مفتوح کی نظر میں حسن بن جاتا ہے اس کے علاوہ دور سے چمکنے والی چیز سونا ہی نظر آتی ہے۔ آقاؤں کا ہر فعل غلاموں کے تردد یک قابل تقلید ہوتا ہے اس کے علاوہ مغربی معاشرت میں ظاہری چمک دمک کچھ ایسی تھی کہ یہاں کے لوگوں کی نظر خیرہ ہو کر رہ گئی غرضکہ ایسے ماحول میں جب ذہن مفلوج ہو گئے تھے اور نظریں خیرہ، اکبر نے تن تنہا مغربی یلغار کو روکنے کی کوشش کی اکبر اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے حقیقت یہ ہے کہ یہ کام ایک شخص کے بس کا تھا بھی نہیں ایک اکبر تو کیا اگر دس اکبر بھی ہوتے تو اس سیلاب کو روک نہ سکتے میرا مقصد اس سے اکبر کی عظمت گھٹانا نہیں ہے، اکبر کی اتنی اہمیت تو مسلم ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارے افکار و خیالات مغربی رنگ میں رنگے جا چکے تھے انھوں نے اپنی بے پناہ طنز و ظرافت کے بل بوتے مغربی سیلاب پر اتنی شدید اور کاری ضرب لگائی کہ علی گڑھ اور برطانوی سامراج دلوں کا بڑھتا ہوا اثر اور ترقی کرتی ہوئی طاقت تحس نحس ہو کر رہ گئی۔ علی گڑھ نے برطانوی قدروں کی حمایت کی تھی اور انھیں مسلمانوں میں عام کرنا چاہا تھا لیکن اکبر نے اس ڈھول کا پول کھول دیا اکبر کو اگر ہم حکیم نہیں کہہ سکتے تو فصاد ضرور کہہ سکتے ہیں۔ برطانوی عظمت کو منجملہ جن چیزوں سے دھکا پہنچا ہے ان سیاسی تحریکات کے بعد سب سے پہلے اکبر کا نام آتا ہے اکبر کا یہی کمال کیا کم ہے کہ اقبال کے لیے زمین ہموار کر دی اکبر کی عدم موجودگی میں اقبال کے کلام کا کیا حشر ہوتا یہ صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے بیان نہیں۔

اقبال کی کامیابی اور اکبر کی ناکامیابی کی ایک وجہ اور ہے۔ اکبر نے اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے جو وسیلہ اختیار کیا وہ طنز و ظرافت تھی۔

لطیف نازک اور پر معنی ظرافت ہر شخص کے بس کی نہیں ہوتی اسی لیے اکبر کا کلام زیادہ تر قہقہوں میں اڑا دیا گیا اس معنویت کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ دی اکبر نے ہنسا کر رلانا چاہا وہ تبسم میں آنسوؤں کا پیغام لائے تھے لیکن عوام کی کم فہمی اسے صرف قہقہہ سمجھ کر رہ گئی یہ نہ دیکھا کہ اس قہقہے میں کتنا کرب کتنا سوز، کتنی بے چینی پوشیدہ ہے۔ اکبر نے حکومت کے خوف سے سرد موسم اور برفبار ہواؤں میں شاہد معنی کے لیے ظرافت کے لحاف کو ترجیح دی۔ طنز و ظرافت کا تعلق جہاں جذبات و حسیات سے ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ ذہن و دماغ سے ہوتا ہے اکبر نے متفرق اشعار کہے لیکن ذہن پر جب تک کوئی عمل مسلسل نہ ہو اثر نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی کامیابی بڑی حد تک اکبر کی ناکامیابی کی رہین منت ہے اکبر ہی کا ایک شعر ہے:

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے — دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

یہ اقبال کی دانشمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے خودی کا ہتھیار اس وقت استعمال کیا جب مسلمانوں کے دل اکبر کے نغمے سے تازہ تازہ گرم تھے۔ اکبر اور اقبال کے مزاج میں کتنا فرق تھا یہ آپ ان دو شعروں سے معلوم کر سکتے ہیں:

اس میں برائی کیا تھی جو میں — احیائے رسم دیرینہ رہا
آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا — منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر تہذیب مغربی کی مخالفت کرتے رہے لیکن لوگوں نے اسے قبول کر ہی لیا۔

جلوۂ ساقی و مے جان لیے لیتے ہیں — شیخ جی ضبط کریں ہم تو پیے لیتے ہیں

اکبر کی ناکامی کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مغرب کی ترقی لادینی، عریانی اور چنگ و رباب سے ہے یہ ان کے سطحی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ اقبال کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے بتایا کہ:

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب — نے ز رقص دختران بے حجاب
محکمی او نہ از لادینی است — نے فروغش از خط لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است — از ہمیں آتش چراغش روشن است

اکبر کی آنکھوں پر قدامت کی عینک تھی، قدامت پرست انسان تھوڑا بہت متعصب بھی ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اور بھلائیاں اسی تہذیب معاشرت اور تمدن سے ہیں جس کا وہ پیرو ہے وہ تو گنوئیں کا مینڈک ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ بحر کی وسعتیں ایک لفظ مہمل ہے اکبر نے جو شعر شیخ جی کے بارے میں کہے تھے وہ ان پر بھی چسپاں ہوتے ہیں۔

حال دنیا سے بے خبر ہیں آپ — گو تقدس مآب بیشک ہیں
شیخ جی پر یہ قول صادق ہے — چاہِ زمزم کے آپ مینڈک ہیں

اقبال کے یہاں سب کچھ ملتا ہے لیکن تعصب نہیں ملتا وہ جانتے ہیں کہ مغرب باوجود اخلاق اور روحانی اعتبار سے اس قدر پست ہونے کے ہمیں بہت کچھ دے سکتا ہے اور وہ بہت کچھ ہے مذذت فکر و عمل

مذذت فکر و عمل کیا شے ہے ذوق انقلاب — مذذت فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب
مذذت فکر و عمل سے معجزات زندگی — مذذت فکر و عمل سے سنگ خارا لعل ناب

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد نے بھی قریب قریب یہی بات کہی تھی:

"اہل یورپ کی عظمت سلطنت نہیں ہے بلکہ ان کی عظمت ان علوم میں ہے جو جدید ایجاد ہوئے ہیں۔ اور ہوتے جاتے ہیں اور جن علوم کے ذریعے سے انھوں نے ریل اور تار برقی اور اسٹیمر اور ہزار ہا قسم کی کارآمد کلیں بنا ڈالی ہیں۔"

اکبر کی ناکامی کی ایک وجہ ان کی تعلیم کا منفی پہلو بھی ہے انھوں نے صرف یہ کہہ دیا کہ یہ راستہ جس پر تم گامزن ہو خطرناک ہے لیکن یہ نہ بتا سکے کہ یہ دوسرا راستہ بھی ہے جو تمہیں منزل مقصود تک پہنچا سکتا ہے۔ اکبر نے انسانوں کو اور انسانوں کے سماج کو چھوئی موئی سے زیادہ نازک سمجھ لیا تھا کہ جہاں چھوا مرجھا گیا شاید وہ ارتقا کے قابل نہ تھے:

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے

شاید انھیں یہ احساس نہیں تھا کہ ع اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد۔ وہ سماج ہی کیا جس میں لچک نہ ہو بڑے سے بڑا درخت اگر آندھی کا مقابلہ کرے گا تو منہ کی کھائے گا۔ زندہ اور قائم وہی رہتا ہے جس میں جھکنے اور طوفان کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہے ممکن ہے کہ مغربی سیلاب بھی ایک تاتاری فتنہ ثابت ہوتا۔ جس طرح اسلام تاتاریوں کے ہاتھوں تباہ حال ہوا اسی طرح اس نے ترقی بھی انھیں کے بل بوتے پر کی۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اقبال کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کو ٹھوس اور جامد نہیں قرار دیا بلکہ نامی اور جدلیاتی تصور کیا۔ اسی سلسلے میں سید سلیمان ندوی کے یہ الفاظ قابل توجہ ہیں۔

"پچاس برس کے تجربے نے یہ بتایا ہے کہ نئی روشنی کی بہترین شعاع وہ ہے جو جدید و قدیم تعلیم کی مثبت و منفی لہروں کے ملنے سے نکلتی ہے ان بجلیوں کو علیحدہ کر دیجیے تو نئی یا پرانی کوئی روشنی پیدا نہ ہوگی"

حالی کے یہاں مفاہمت ہے، اکبر کے یہاں احساسِ شکست ہے اور "لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو" کی صدائے بازگشت ہے، لیکن اقبال کے یہاں اعلان جنگ ہے اور یہی وجہ اکبر کی ناکامی اور اقبال کی کامیابی کی ہے، حالی اور سرسید کے یہاں اندھا دھند تقلید کرنے کا نعرہ ہے اور اکبر کے یہاں قدامت پسندی کی تلقین ہے۔ ظاہر ہے دونوں کے نقطۂ نظر انتہا پسند تھے۔ ان میں توازن کی ضرورت تھی، چناں چہ اقبال نے ہمیں ایسا پیغام دیا جس میں اعتدال اور توازن ہے مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں سرسید حالی اور اکبر کی بہترین تعلیم ملتی ہے یعنی وہ تعلیم جس میں نہ انتہائی تعصب سے کام لیا گیا ہے نہ انتہائی عقیدت سے بلکہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والے کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آپ خودی کے فلسفے کو کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیجیے پھر دیکھیے کہ اقبال کے یہاں کیا رہ جاتا ہے یہی سرسید، حالی، اور اکبر کے خیالات کی صدائے بازگشت، وہی مشرقیت کو ہاتھ سے نہ جانے دو لیکن مغرب سے بھی جتنا حاصل کر سکو کر لو:

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر فطرت کا تقاضا ہے کہ ہر شب کو سحر کر

۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ — ماہنامہ جامعہ کا خاص نمبر شایع ہو گیا

ماہنامہ **جامعہ** کا، پچھلے سال کی طرح، امسال بھی **جائزہ نمبر** شایع ہوا ہے، جس میں ہندوستان اور پاکستان کی ۱۹۶۲ء کی مطبوعات کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ نیز ۶۲ء میں جن ادیبوں کا انتقال ہوا ہے، ان کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ اور ہندوستان کے تصنیفی اداروں پر بھی ایک مضمون شامل ہے۔

پتہ: ماہنامہ جامعہ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

شاعرِ مشرق

سعادت نظیر

یادِ ایام کہ مسموم تھی مشرق کی فضا
ہر سخنور کی صدا دیتی تھی پیغامِ قضا

شاعری نام تھا الفاظ کی صنّاعی کا
عام فقدان تھا مضمون کی رعنائی کا

نقشِ بے رنگ تھی اربابِ سخن کی محفل
لیلیٰ حکمت و معنی سے تھا خالی محمل

عقل و دانش پہ تھا اک خوابِ گراں سا طاری
بختِ خوابیدہ کہاں، اور کہاں بے داری

تو نے وہ بربطِ نو چھیڑ دیا، اے اقبال!
جس کے ہر سر میں ہے فطرت کا جمال و جلال

تیری آواز سے اقوامِ وطن جاگ اُٹھے
اک نئی شان سے جذباتِ عمل جاگ اٹھے

تیرے نغمات پہ اربابِ وطن جھوم اُٹھے
جھوم اٹھے اہلِ نظر، اہلِ سخن جھوم اٹھے

گونج اٹھے تیرے ترانے کچھ اس انداز کیساتھ
نطق مربوط ہو جیسے لبِ اعجاز کے ساتھ

تیری آواز ہے یا ٹوٹے ہوئے دل کی صدا
درد میں، سوز میں ہے ڈوبی ہوئی تیری نوا

اللہ اللہ! ترا اسلوبِ بیانِ گل کار!
نظر آنے لگے ویرانے میں آثارِ بہار

دردِ دل تھا جو تری سعیِ خوش انجام کیساتھ
جاگ اٹھا قوم کا اقبال ترے نام کیساتھ

تیرے افکارِ جواں نے وہ مسیحائی کی
روح سی پھونک دی ہر جسم میں برنائی کی

تیری پرواز کی رفعت سے فلک ہیں پامال
پایۂ عرش کو چھوتے ہیں ترے فکر و خیال

فکر سے تیرے ملا شعر کو کچھ ایسا مقام
شاعری بن گئی اک حسنِ عمل کا پیغام

جس کے ہر شعر میں جادو ہے، وہ شاعر تو ہے
فلسفہ جس پہ ہے نازاں، وہ مفکر تو ہے

تیری لے میں ترے نغمات جو سن پاتے ہیں
حوصلے عشق کے کچھ اور ابھر آتے ہیں

تیری باتوں سے ٹپکتا ہے خرد ساز فسوں
تیرا احساسِ خودی اور ترا ذوقِ جنوں

تو نے آئینۂ امروز میں فردا دیکھا
جو نہ اوروں کو نظر آیا وہ جلوا دیکھا

زندگی بخش حقائق ترے اشعار میں ہیں
اور عرفان کے نکتے تری گفتار میں ہیں

تیری ہر نظم میں ہے روشنی سیّاروں کی
تیرے ہر گیت میں خوشبو ہے چمن زاروں کی

جو درخشاں نہیں گردوں پہ، وہ خورشید نہیں
تو وہ شاعر نہیں، جو زندۂ جاوید نہیں